ایقانِ اقبال

پروفیسر محمد منور

اقبال اکادمی، پاکستان

ایقانِ اقبال

میں ہوں صدف تو تیرے ہاتھ میرے گہر کی آبرو !
میں ہوں خذف تو تُو مجھے گوہرِ شاہوار کر !

ایقانِ اقبال

پروفیسر محمدّ منوّر

اقبال اکادمی پاکستان
۱۱۶۔ میکلوڈ روڈ ـــــ لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

ناشر : اقبال اکادمی پاکستان
۱۱٦ - میکلوڈ روڈ ، لاہور

طابع : میاں محمد یعقوب

مطبع : حمایت اسلام پریس ریلوے روڈ لاہور

نگران طباعت : فرخ دانیال

طبع اول : جنوری ۱۹۷۷ء
ایوان اردو - ڈی ۱۴۳ بلاک بی نارتھ
ناظم آباد ، کراچی

طبع دوم : مارچ ۱۹۸۴ء

تعداد : ۱۱۰۰

قیمت : ۳۵ روپے

انتساب

مشفق مکرم
جناب پروفیسر کرامت حسین جعفری (مرحوم)
کے نام

فہرست

عرض داشت	۱
پیش لفظ	۵
علامہ اقبال اور تعلیم آدمیت	۱۰
علامہ اقبال کا تصورِ تقدیر	۴۶
علامہ اقبال اور ابراہیمیؑ نظر	۷۴
علامہ اقبال اور حیات بعد الموت	۹۵
علامہ اقبال کا تصورِ ملت ۔ ماضی ، حال ، مستقبل	۱۲۲
علامہ اقبال اور مرگِ مجازی	۱۶۷
فقر ۔ کلام اقبال کی روشنی میں	۱۹۸
ضمیمہ	۲۱۹
اشاریہ	۲۲۳

عرض داشت

''میزانِ اقبال'' میں سات مقالے شامل تھے۔ ان کا تعلق حضرت علامہ کے فکری پہلوؤں کے مقابل ادبی پہلوؤں سے زیادہ تھا۔ میں نے میزانِ اقبال کے التجائیہ میں یہ عرض کیا تھا کہ وہ مقالے جن کا بیشتر تعلق حضرت علامہ کے نظریات و افکار سے ہے ایک اور کتاب میں شامل ہو رہے ہیں۔ کتابِ موعود کے نام کا بھی اعلان کر دیا تھا، یعنی ''ایقانِ اقبال''۔

مگر ''ایقان'' سے قبل ''علامہ اقبال کی فارسی غزل'' مرتب کرنا پڑ گئی۔ اس کتاب کا کوئی اعلان نہ تھا۔ اعلان کہاں کا، کوئی ارادہ ہی نہ تھا۔ وہ تو فی البدیہہ لکھنی پڑگئی تھی جیسا کہ میں نے اس کتاب کے دیباچے میں تصریح کی ہے۔ ''ایقان'' کے ضمن میں بعض دوستوں اور شاگردوں کی یاد دہانی اصرار بن گئی۔ ان میں جناب پیر طریقت شیخ عبدالشکور، محمد خورشید عاصم، ڈاکٹر محمد صدیق شبلی، اظہر جاوید طارق اور ڈاکٹر صفدر محمود نے گویا خدائی فوجدار کا روپ دھار لیا۔ شاگردوں میں محمد سہیل عمر کا مسلسل اصرار رہا کہ ''ایقان'' جلدی مرتب ہو جانی چاہیے، سہیل کے اصرار کی تائید رؤف اور دانیال جیسے جن کر رہے تھے، لہٰذا جی میں ٹھان لی کہ آئندہ قبل از وقت کسی کتاب کا اس طرح اعلان نہیں کروں گا، اعلان کا یہ نقصان ہوتا ہے کہ پھر کتاب مرتب کرنی پڑ ہی جاتی ہے۔

بہر حال حضرت علامہ اقبال کے بعض نظریات کو سمجھنے کی یہ ناکام کوشش آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں ''من آنم کہ من دانم''، موضوعات بڑے اہم ہیں۔ ان تک صحیح معنوں میں میرے ذہن کو رسائی حاصل نہیں لہذا اہل علم و دانش دیکھ لیں گے کہ مجھ سے کیا کیا کوتاہیاں سرزد ہوئی ہیں، مگر میں نظیری کی زبان میں پیشگی معذرت عرض کر رہا ہوں:

ع کہ نو پروازم و شاخِ بلندے آشیاں دارم

جناب محترم ڈاکٹر ایس اے رحمان صاحب نے ''پیش لفظ میں میری بڑی حوصلہ افزائی فرمائی ہے۔ یہ ان کی عزیز پروری اور شفقت ہے۔ جہاں تک دوستوں کا معاملہ ہے ان کے لیے میری ہر تحریر تحفۂ محبت ہے، اور یہ میری انتہائی خوش قسمتی ہے۔ رہے شاگرد تو وہ اپنے استادوں کو اونچا اڑاتے ہی ہیں، ان کا کوئی کیا بگاڑ لے گا۔ میرے عزیز رانا محمد اکرام نے جس شغف اور خلوص سے ''علامہ اقبال کی فارسی غزل'' اور ''ایقان اقبال'' کی خوبصورت اور صحیح کتابت کی نگرانی کی ہے، اس کے جواب میں اظہار تشکر کے ساتھ ساتھ دعاگو ہوں کہ خدا انہیں خیر و برکت سے نوازے۔

میں نے ''علامہ اقبال کی فارسی غزل'' کے اعتذار میں عرض کیا تھا کہ اسے اور ''ایقان اقبال'' کو پاکستان کی مشہور فرم بروک بانڈ پاکستان لمیٹڈ ہی چھپوا رہی ہے۔ اس ضمن میں فرم کے مینجنگ ڈائریکٹر جناب بنسیلے صاحب اور مظفر احمد بھٹہ صاحب دوستانہ شکریے کے مستحق ہیں۔ بروک بانڈ کی انتظامیہ کی بطورِ خاص فرمائش یہ تھی کہ میں انہیں اپنی ایسی تحریریں چھاپنے کی اجازت دوں جن کا تعلق حضرت علامہ سے ہو تا کہ انہیں بھی حضرت علامہ کی ولادت کے جشنِ صد سالہ میں کسی قدر

"شرکت کا شرف" حاصل ہوسکے، یہ ادا لائق داد ہے اور اس میں یہ ترغیب شامل ہے کہ دوسرے تجارتی ادارے بھی ملک کی علمی رونق بڑھانے میں حصے دار ہوں۔

(پروفیسر) محمد منور
گورنمنٹ کالج
لاہور

مورخہ ۱۰ جولائی
۱۹۷۶ء

میانِ ما و بیت اللہ رمزے ہست
کہ جبریلِ امیں راہم خبر نیست

عرض داشت

طبع دوم

''ایقانِ اقبال'' کا پہلا ایڈیشن ۱۹۷۷ء میں چائے کی بروک بانڈ کمپنی نے کراچی سے شائع کیا تھا ـــــــ وہ ایڈیشن احباب اور قارئین نے پسند کیا ، بہت سے عزیزوں اور بزرگوں نے بذریعہ خطوط داد دی اور اس طرح حوصلہ افزائی کی ، مجھے خوشی ہوئی کہ میں نے حضرت علامہ اقبال کے افکار کی ترجمانی کے باب میں کسی حد تک کامیابی حاصل کی ہے ۔ میں سمجھتا ہوں کہ حضرت علامہ کے افکار کو عام کرنا روح اسلام اور معانی قرآن کو عام کرنا ہے ، اور مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ بیسویں صدی عیسوی میں جس قدر حضرت علامہ کے افکار نے اُمت کے دلوں کو ڈہاڑس بندھائی اس قدر بہت کم افرادِ اُمت سے ممکن ہو سکا ، امت کا یہ دور دورِ اقبال مندی ہے ۔

اقبال اکادمی میں میرے پیشرو ڈاکٹر وحید قریشی صاحب میرے پُرخلوص شکریے کے مستحق ہیں ، جنہوں نے مجھ سے فرمائش کی کہ میں ''ایقانِ اقبال'' کے طبع دوم کے اختیارات اقبال اکادمی کو دے دوں ـــــــ یہ میرے لیے فخر کا مقام تھا ، اقبال اکادمی میری کتاب ''برہان اقبال'' اس سے قبل شائع کر چکی تھی ۔ میں اکادمی کی مجلسِ عاملہ کے ارکان کا بھی بصمیمِ قلب شکر گزار ہوں جنہوں نے ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کی سفارش کو شرف قبول

کر کے ''ایقان اقبال'' کو اکادمی کی طرف سے شائع کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی ۔

میرے عزیز رفیق چوہدری نے اس کتاب کے پروف پڑھے اور سید وحید الزماں نے اشاریہ مرتب کیا ۔ فرخ دانیال نے کتاب طبع کرانے کے ضمن میں بھرپور دلچسپی لی ، میں ان حضرات کا بھی شکر گذار ہوں ۔ کتاب اللہ کے سوا کوئی کتاب بھی غلطیوں سے مبرا نہیں اور میں تو اہل علم کا خاک پا بھی نہیں ---—— لہذا قارئین کرام سے التجا ہے کہ مجھے ''ایقانِ اقبال'' میں پائی جانے والی غلطیوں سے ازراہ کرم آگاہ فرمایا جائے تاکہ اگر تیسرا ایڈیشن شائع کرنے کا موقع میسر آئے تو ان کا ازالہ کر دیا جائے ۔

مورخہ

۲۴ مارچ ۱۹۸۴ء

والسّلام

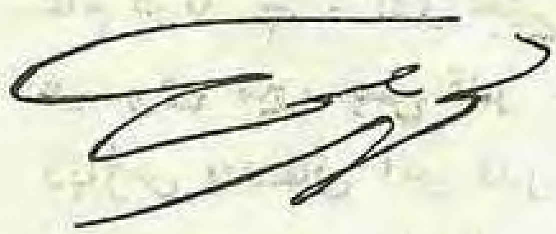

محمد منور

پیش لفظ

اقبال نے دنیا میں اس وقت آنکھ کھولی جب اس برِ صغیر میں سلطنت اسلامیہ گل ہو چکی تھی ، امتِ مسلمہ ہر خطے میں ذہنی انتشار اور قنوطیت کا شکار تھی ، عالمی حالات جمعیتِ اسلامیہ سے ساز گار نہ تھے ، مغربی سامراج اور استعماریت کا قابوس افریقہ اور ایشیا کے سینے پر سوار تھا ۔ اگرچہ بعض اسلامی ممالک میں تحریکِ احیاء کے ابتدائی نشانات اُبھر رہے تھے لیکن سیاسی اعتبار سے سب کا حال سقیم تھا ۔ ایسی یاس انگیز فضا میں دانۂ اُمید کے پنپنے کے امکانات محدود ہو جاتے ہیں ۔ چنانچہ علامہ شبلی کے دلی کرب کا اظہار ان کے اس شعر سے ہوا ۔

مراکش جا چکا ، ایران گیا ، اب دیکھنا یہ ہے!
کہ جیتا ہے یہ ٹرکی کا مریضِ نیم جاں کب تک

تاہم بعض اوقات فطرت کی پنہاں قوتیں پُر اسرار طریقوں سے دریائے حیات کو موج آشنا کر دیتی ہیں ۔ اس برِ صغیر میں اقبال کی پیدائش بھی اسی قبیل کا ایک معجزاتی سانحہ تھی ۔ اقبال کی مسیحا نفسی نے ملتِ اسلامیہ کے جسدِ افسردہ میں ایک نئی روح پھونک دی اور ملت کا کارواں اسلامی تشخص کی منزل کی طرف پھر سے جادہ پیما ہو گیا ۔ ایسے نابغۂ روزگار قوموں کی تاریخ میں مدتوں بعد پیدا ہوتے ہیں لیکن اُن کا ظہور ایک فکری انقلاب کا

پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے۔

عمر ہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

روایت میں اُلجھی ہوئی تقلیدی ذہنیت اور محورِ باطنیت کے گرد گھومنے والی خلوت پسند قدوسیت نے اسلامی اجتماعی شعور کے خدوخال دھندلا دیے تھے۔ ماحول ایک مردِ خود آگاہ کے انتظار میں تھا جو سر نہ تراشے مگر راہ و رسمِ قلندری کا راز داں ہو، جو روحِ عصر کا بخوبی شناسا ہو، جو عجمیت گزیدہ ذہنوں میں خودی کی قندیل روشن کر دے اور فعال زندگی کی قدروں کو اجاگر کر کے جہان آرزو کو دگرگوں کر دے، اقبال نے ہندی مسلمانوں کے لیے یہی انقلابی کردار ادا کیا۔

ایسی تہ دار اور پہلو دار شخصیت کے افہام و تفہیم کے لیے شارح کا قلم ادب خوردۂ عشق و مستی اور تہذیب یافتۂ علم و دانش ہونا چاہیے۔ اقبال مجمع البحرین تھے، وہ بیک وقت مشرقی علوم و عرفان اور مغربی افکار و عمل کے رمز شناس تھے۔ ان کے اقوال اور ان کے اشعار کے پس منظر میں یہ دونوں علمی دھارے شیر و شکر ہوتے نظر آتے ہیں۔ لہٰذا ان کے ناقد کے لیے ضروری ہے کہ ان کے تصورات و خیالات کے سانچوں کی شناخت کے ساتھ ساتھ ان کے فکر و احساس کے سوتوں کا بھی شعور رکھتا ہو۔

''میزانِ اقبال'' کے بعد اس کتاب کے ساتھ پروفیسر مرزا محمد منور، اقبال کے شارحین کے حلقے میں دوبارہ قدم رکھ رہے ہیں۔ وہ خود اقبالیات کے پُرجوش طالب علم ہیں، اور نوخیز ذہنوں کو اقبال شناسی کے نور سے جلا دینے کا اہم فریضہ اپنائے ہوئے ہیں۔ یومِ اقبال کی تقریبوں میں متعدد مرتبہ ان کی دلنشیں تقریریں سننے کا موقع ملا اور ہر دفعہ میں ان کے شگفتہ خیالات، ان کے پُرخلوص اندازِ گفتگو، اور ان کی بالغ نظری سے بدرجۂ غایت متاثر ہوا۔ وہ مغربی

فلسفہ اور سائنس کے بنیادی تصورات سے بخوبی آگاہ ہیں اور مشرقی روایات علم و فیضان کے بھی رسیا ہیں ۔ وہ اردو ، فارسی اور عربی ادب کی تخلیقات سے بہرہ اندوز ہیں ۔ وہ خود ایک خوش فکر شاعر اور ادیب ہیں ۔ اور یوں علم و احساس دونوں کی فیاضیوں سے باثروت ، گویا ہر لحاظ سے وہ اقبال کے مفسر اور شارح ہونے کے اہل ہیں ۔

زیر نظر تالیف کے لیے انہوں نے فکر اقبال کے بنیادی اور مرکزی موضوعات میں سے سات کا انتخاب کیا ہے ۔ یہ مضامین ان کی وسعت مطالعہ پردال ہیں اور ان کی دلآویز نکتہ طرازیوں کے نمونے ۔ انہوں نے فکر اقبال کے ڈانڈے کامیابی کے ساتھ جدید نظام فلسفہ اور قدیم مشرقی روحانیات سے ملائے ہیں ۔ انہوں نے قرآن و حدیث سے بھی استشہاد کیا ہے اور ادب ، فلسفہ اور تصوف کے دفاتر سے بھی ۔ ان کا انداز تحریر صاف و شفاف ہے اور انہوں نے جو کچھ اقبال سے پایا ہے شرح و بسط سے دوسروں تک پہنچانے کی بلیغ سعی کی ہے ۔ کہیں کہیں ادیبانہ شان کے بجائے خطیبانہ جھلک آ گئی ہے ، یہ شاید افہام و تفہیم کی منزلوں کا تقاضا ہے یا ان کے تدریسی منصب کی دین ۔ بہرحال جو کچھ جس رنگ میں ہمیں ان سے ملا ہے اس کی قدروقیمت میں کلام نہیں ۔ موضوعات کا انتخاب خود ان کی علمی دلچسپیوں کی نوعیت کا غماز ہے ۔ عنوانات ملاحظہ فرمائیے : ''علامہ اقبال کا تصور تقدیر'' ، ''فقر کلام اقبال کی روشنی میں'' ، ''اقبال اور ابراہیمی نظر'' ، ''علامہ اقبال اور تعلیم آدمیت'' ، ''علامہ اقبال اور تصور ملت ــ ماضی ، حال ، استقبال'' ، ''علامہ اقبال اور حیات بعدالموت'' ، ''علامہ اقبال اور مرگ مجازی''۔ ان موضوعات سے شغف اس حقیقت کی نشان دہی کرتا ہے کہ پروفیسر صاحب کی توجہ اسلوب سے زیادہ اقبال کے مغز فکر پر مرکوز ہے ۔ اس بارے میں ان کا انداز نظر خود فکر اقبال سے ہم آہنگ ہے ۔ اقبال اپنے آپ کو شاعر سے زیادہ ایک مفکر کی

حیثیت سے متعارف کرانے کی آرزو رکھتے تھے ۔ چنانچہ فرماتے ہیں ۔

مجو خیرے ازاں مردِ فرو دست　　که بر من تہمتِ شعرو سخن بست

پھر جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور عرض کرتے ہیں ۔

بآں رازے کہ گفتم پے نبردند
ز شاخِ نخلِ من خُرما نخوردند

من اے میرِ اُمم! داد از تو خواہم
مرا یاراں غزل خوانے شمردند

یہ الگ بات ہے کہ فلکِ ادب کی رفعتیں کلامِ اقبال کو جھک جھک کر چومتی ہیں ، اقبال کا مقصد کچھ بھی ہو قالبِ شعر ان کے فکر کا فطری لباس ثابت ہوا ۔ غالب کے الفاظ اقبال پر بھی راست آتے ہیں ۔

ع　شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فنِ ما

پروفیسر محمد منور کے رشحاتِ قلم کی علمی سطح بلند ہے ، اسی بلندی کے واسطے سے ہم نے آئندہ کے بارے میں کچھ توقعات ان سے وابستہ کر لی ہیں ۔ مجھے امید ہے کہ پروفیسر صاحب ان توقعات کا احترام کرتے ہوئے اپنی قلمی کاوشوں کا سلسلہ جاری رکھیں گے اور اہلِ ذوق سے تحسین کا خراج وصول کرتے رہیں گے ۔

ایس ۔ اے رحمٰن

(ریٹائرڈ) چیف جسٹس ، پاکستان

دلِ بینا بھی کر خدا سے طلب
آنکھ کا نور، دل کا نور نہیں

علامہ اقبال اور تعلیمِ آدمیت

حضرت خواجہ نظام الدینؒ اولیاء نے درویشوں کے مکارمِ اخلاق کے باب میں گفتگو کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ شیخ ابو سعید ابوالخیرؒ اور بو علی سینا کی ملاقات ہوئی ۔ رخصت ہونے سے قبل بو علی سینا نے ایک صوفی سے جو حضرت شیخ ابو سعیدؒ کے ملازمین میں سے تھا ، یہ فرمائش کی کہ جب میں حضرت شیخ کے یہاں سے رخصت ہو جاؤں تو پھر وہ جو کچھ میرے بارے میں کہیں تم مجھے لکھ بھیجنا ۔ بو علی سینا چلے گئے مگر حضرت نے ان کا کوئی ذکر نہ کیا ۔ ان کے بارے میں نیک و بد کچھ نہ فرمایا ۔ چنانچہ اس صوفی نے ایک روز پوچھ ہی لیا کہ بو علی سینا کیسا آدمی ہے ؟ حضرت شیخ نے جواب دیا ۔ وہ ایک فیلسوف شخص ہے ، طبیب ہے ، بڑا عالم بھی ہے ، البتہ مکارمِ اخلاق کا مالک نہیں (اما مکارمِ اخلاق ندارد) ۔ اس صوفی نے یہ بات بو علی سینا کو لکھ بھیجی ۔ بو علی سینا نے حضرت شیخ کی خدمت میں کچھ تحریر کیا جس میں یہ بھی مذکور تھا کہ میں نے اتنی کتابیں مکارمِ اخلاق کے بارے میں لکھی ہیں ، پھر حضرت شیخ یہ کیوں کہتے ہیں کہ میں مکارمِ اخلاق کا مالک نہیں ۔ حضرت شیخ نے تبسم فرمایا اور گویا ہوئے ''میں نے یہ تو نہیں کہا کہ بو علی سینا مکارمِ اخلاق جانتا نہیں (من نگفتہ ام کہ بو علی مکارمِ اخلاق نداند) ، میں نے یہ کہا ہے کہ وہ مکارمِ اخلاق کا مالک نہیں (مکارمِ اخلاق ندارد)[1] ۔

۱۔ فوائد الفواد (فارسی) ملک سراج الدین اینڈ سنز ، کشمیری بازار لاہور ۔ ص ۲۲،۳۲۱ ۔

بو علی سینا یہ تو جانتے تھے کہ اشرف اور اعلیٰ اخلاق کیا ہیں ، مگر علم اور چیز ہے اور عمل اور شے۔ نیکی ، بھلائی ، اچھائی ، ایثار ، استقامت ، رحم دلی ، اتقا وغیرہ کے باب میں کتنی ہی وسیع معلومات کیوں نہ حاصل ہو جائیں ، اگر وہ معلومات محض سرمایۂ دماغ ہیں اور متاعِ جان نہیں تو اس سے صاحبِ معلومات کی اصلاح و فلاح کا راستہ نہیں کھلتا ، اس لیے کہ خالی معلومات کا نام تربیت نہیں ، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے : ''العلم علمان فعلم فی القلب فذالک العلم النافع و علم علی اللسان فذالک حجۃ اللہ علی ابن 'ادم''[۱] یعنی علم دو طرح کے ہیں ، ایک وہ جو دل میں ہو ، اور وہ علم نافع ہے ۔ دوسرا وہ جو زبان پر ہو ، وہ اللہ کی طرف سے اولادِ آدم کے باب میں اتمامِ حجت کی حیثیت رکھتا ہے — علم جو دل میں ہے وہ جزوِ جان ہوتا ہے اور عمل بن جاتا ہے اور دوسرا جو سرمایۂ دماغ ہے اور زبان سے بیان ہوتا رہتا ہے وہ عمل پر اثر انداز نہیں ہوتا ، وہ اپنے پڑھنے ، یاد رکھنے اور بیان کرنے والے کی شخصیت کی اصلاح و تعمیر میں مُمد نہیں ہوتا ، البتہ قیامت کے روز بے علم اور جاہل کے مقابل اُسے آسانی سے سزا دلوا دے گا، اس لیے کہ وہ گواہ ہوگا اس امر کا کہ اس شخص نے علم و آگہی کے باوصف اپنا عمل سدھارنے کی کوشش نہ کی۔ گویا علم حاصل کرنا بہت بڑی بلکہ خطرناک ذمہ داری قبول کرنا ہے۔

مطلب یہ کہ اصولاً علم کی ترقی کے ساتھ ساتھ آدمی کی آدمیت پر اچھا اثر پڑنا چاہیے ، علم کی گہرائی اور وسعت کے مطابق آدمی کے احساسات اور نظریات میں لطافت اور کشادگی واقع ہونی چاہیے ، اور اس میں بقدرِ علم بہتر سے بہتر انداز میں زندگی بسر کرنے کی

۱- فیض القدیر مکتبہ مصطفی البابی مصر ، ص ۴۴ (جلد اول)

اہلیت پیدا ہونی چاہیے - بقول علامہ اقبال -

آ گہی از علم و فن مقصود نیست　　غنچہ و گل از چمن مقصود نیست
علم از سامانِ حفظ زندگی است　　علم از اسبابِ تقویمِ خودی است[۱]

اسی سے ملتا جلتا مضمون ایک اور مقام پر بیان ہوا ہے -

زندگی کچھ اور شے ہے ، علم ہے کچھ اور شے
زندگی سوزِ جگر ہے ، علم ہے سوزِ دماغ

علم میں دولت بھی ہے، قدرت بھی ہے، لذت بھی ہے
ایک مشکل ہے کہ ہاتھ آتا نہیں اپنا سراغ[۲]

ٹھیک ہے کہ علم کی وساطت سے رزق کے بہتر وسائل میسر آ جاتے ہیں ، علم کی وساطت سے بہتر ہتھیار ہاتھ لگ جاتے ہیں ، علم کی وساطت سے آرام و آسائش اور گونا گوں لذتوں کے اسباب مہیا ہو جاتے ہیں لیکن اس سب کچھ کا حاصل ہو جانا کسی کے بہتر انسان ہونے کی دلیل نہیں بلکہ عین ممکن ہے کہ ایک ناتربیت یافتہ شخصیت علم کو تن پروری کا ذریعہ بنا کے اپنی تباہی کا سامان پیدا کر لے- مولانا روم نے یہی تو فرمایا تھا :

علم را برتن زنی مارے بود　　علم را بر دل زنی یارے بود[۳]

اور علامہ اقبال نے کہا ہے -

علم را بے سوزِ دل خوانی شراست　　نورِ او تاریکیٔ بحر و بر است ![۴]

یعنی علم کو دل میں جگہ دو تو وہ مدد گار اور دوست ہے اور اس سے تن پروری چاہو تو سانپ ثابت ہو گا -

اگر بسیط انداز میں دیکھیں تو بالکل واضح ہے کہ عالم کو بے علم پر فضیلت حاصل ہے ، جیسا کہ قرآن کریم کا ارشاد ہے -

---

۱- اسرار خودی ، ص ۱۷/۱۷ -
۲- ضربِ کلیم ، ص ۹/۵۱۴۷ -
۳- بال جبریل ، ص ۱۳۴/۴۲۶ - اسرار خودی ، ص ۶۶/۶۶ -
۴- جاوید نامہ ، ص ۷۴/۶۶۲ -

"ھل یستوی الذین یعلمون و الذین لایعلمون"[1]۔ (کیا اصحابِ علم اور بے علم برابر ہوتے ہیں ؟) ظاہر ہے کہ جواب نفی میں ہے ، علم والے اور علم سے محروم برابر کیسے ہو سکتے ہیں ، اسی طرح مثلاً قرآن کریم کا استفسار ہے "ھل یستوی الاعمیٰ و البصیر"[2]۔ (کیا اندھا اور آنکھوں والا برابر ہے) ؟ واضح ہے کہ برابر نہیں ۔ ہاں علم والا اگر علم سے مستفید ہونے اور دوسروں کو مفاد پہنچانے کے بجائے علم کو اپنے لیے بھی اور دوسروں کے لیے بھی وجہ فساد بنا دے تو پھر کہا جائے گا کہ ایسے عالمِ فتنہ گر سے جاہل امن جو بہتر، اسی طرح آنکھوں والا اگر دیکھنے بوجھنے کے باوصف اچھائی کی راہ اختیار نہ کرے ، بدی کا راستہ چن لے ، وہ خیر و شر میں تمیز کر سکنے کے باوصف شر کو خیر پر ترجیح دے تو کہا جائے گا کہ اس کی آنکھیں دیکھتی تو ہیں مگر انہیں نظر کچھ نہیں آتا ، قرآن کا یہ بھی اعلان ہے "فانھا لا تعمی الابصار و لکن تعمی القلوب التی فی الصدور"[3]۔ (آنکھیں اندھی نہیں ہو جاتیں بلکہ وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں کے اندر ہیں) ۔ الغرض علم وہی علم ہے جس کا مصدر قلب ہے ، روشنی وہی روشنی ہے جس کا منبع قلب ہے ۔ ورنہ بقول حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ "زبان بہت بڑی عالم ہو گی اور دل جاہل ہو گا"۔ ایسے علم کا کوئی فائدہ نہیں ، "لا ینفع لسان علیم و قلب جاھل"[4]۔ گویا نا تربیت یافتہ شخصیت کے لیے دیگر ہر دولت ، وسیلے یا ہتھیار کی طرح علم بھی ایک خطرناک ذمہ داری ہے ۔ کہا گیا ہے کہ علم روشنی ہے ، علم چراغ ہے ، بجا ، مگر کیا چراغ کی روشنی

۱۔ قرآن کریم ۔ سورہ ۳۹ ، آیت ۹ ۔
۲۔ " " ۔ سورہ ۶ ، آیت ۵۰ ۔
۳۔ " " ۔ سورۃ ۲۲ ، آیت ۴۶ ۔
۴۔ الفتح الربانی ، مطبع المصطفی البابی ، مصر ۔ ص ۴۰ ۔

بلکہ چاند اور سورج کی روشنی سے بھی بدنیتی کے باعث غلط کام نہیں لیا جا سکتا ؟ مثلاً شبِ تار میں چراغ بڑی نعمت ہے لیکن اس کا کام راہ دکھانا ہی تو ہے ، راہ متعین کرنا چراغ کا کام نہیں - اگر آپ چراغ سے کوچۂ گناہ کی سیر کے ضمن میں امداد طلب کریں تو چراغ انکار نہ کرے گا ، چاند راہ دکھائے خواہ سورج ، وہ ہر دو ہر راہ دکھائیں گے ، اپنی طرف سے پکڑ کر خیر کی راہ پر زبردستی نہ ڈالیں گے :

دل بینا بھی کر خدا سے طلب　　آنکھ کا نور، دل کا نور نہیں[1]

اس طرح دیکھیں تو لفظی اور کتابی علم بہم پہنچانے کے عمل کو 'تعلیم' کہا جائے گا جس کا انگریزی مرادف Instruction ہے - اس کے مقابل وہ علم جس سے آدمی کو آدمیت سکھائی جائے ، اسے بہتر سے بہتر انسان بنایا جائے 'تربیت' کہلاتا ہے ، اس کا انگریزی مرادف Education ہے - ظاہر ہے کہ Instruct کرنا اور چیز ہے اور Educate کرنا اور ، مگر ہم نے بڑی سہولت سے Education کا ترجمہ تعلیم کر کے تربیت کا مفہوم ہی غائب کردیا ہے یا شاید یہ فرض کر لیا ہے کہ تعلیم ہی میں تربیت کا مفہوم بھی سما گیا ہے -

اب یہ تو واضح ہے کہ آدمی کا وجود مادی بھی ہے اور روحانی بھی ، مادی وجود کثیف ہے وہ زمین کی طرف کھنچتا ہے ، روح کی لطافت اوپر کو اٹھاتی ہے ، اور کش مکش آدمی کو پریشان اور مضطرب رکھتی ہے ، مگر کس آدمی کو ؟ اسی کو جس کا یہ احساس بیدار ہو کہ وہ محض مادی وجود کا مالک نہیں ، اس کے اندر ایک شے اور بھی ہے اور وہ اس اللہ کی روح کا کوئی حصہ ہے جو زمینوں آسمانوں کا نور ہے - ارشاد ربانی ہے ''و نفخت فیہ من روحی''[2] (میں نے آدم کے پتلے میں اپنی روح پھونکی) - غرض

۱- بال جبریل ، ص ۳۳۵/۴۳ -
۲- قرآن کریم - سورۃ ۱۵ ، آیت ۲۹ -

جسم کا یہ تقاضا ہے کہ نیچے کو کھینچے ، روح کا تقاضا یہ ہے کہ اوپر کو لے جائے۔ اگر وہ جسم کے ہاتھوں بے بس ہو کر رہ جائے تو وہ انسانی سطح سے نیچے کو چلا جائے گا اور بہائم و حیوانات میں شامل ہو جائے گا ، اور مزید بے بس ہو گا تو پھر گھاس اور پتوں کی سطح پر جا اُترے گا اور آخر جیتے جی مر جائے گا ، مٹی جا کے مٹی میں مل جائے گی ۔ ایسا آدمی جو روح کی زندگی سے قطعاً محروم ہو جاتا ہے انسانی شکل میں حیوان ہے یا یوں کہہ لیجیے کہ چلتا پھرتا ملبہ ہے ۔ ہم مادی وجود کے اساسی تقاضوں کو جبلت کہہ لیتے ہیں اور حق یہ ہے کہ ہر جبلت انسان کی جوہری قوت ہے ، اس کے بغیر اس میں کوئی کمال پیدا ہو ہی نہیں سکتا لیکن جبلت ایک تو نہیں ، کئی ہیں اور ہر ایک اپنی تسکین چاہتی ہے ۔ اگر ان پر عقل و ضمیر کا تازیانۂ تادیب اثر انداز نہ ہو تو وہ شے جسے توازن و تناسب کہتے ہیں پیدا نہیں ہوتی ، اعتدال کا دامن ہاتھ میں نہیں رہتا ۔ نتیجہ یہ کہ آدمی کا وجود ہوس کا محشرستان بن جاتا ہے ۔ وہ روحانی اعتبار سے اپنا وقار کھو بیٹھتا ہے ، انسان نہیں رہتا ، دو پایہ بن جاتا ہے خواہ بظاہر وہ کتنا ہی خوش منظر اور خوش گفتار ہو ، کتنے ہی متمدن لباس میں ملبوس ہو ۔ یوں کہہ لیجیے کہ جبلتوں کے وحشی گھوڑوں کو لگام نہ دے سکنے والا اور محض تن کی یا ملبے کی پرورش کرنے والا انسان بحیثیت انسان مر جاتا ہے ۔ ظاہر بین آنکھیں انہیں زندہ دیکھتی ہیں ، حقیقت بین آنکھیں انہیں مردہ جانتی ہیں ۔ علامہ اقبال کہتے ہیں :

دلے چوں صحبتِ گل می پذیرد ہماں دم لذتِ خوابش بگیرد
شود بیدار چوں 'من' آفریند چوں 'من' محکومِ تن گردد بمیرد[۱]

یعنی جب کوئی دل مٹی کا قرب قبول کرتا ہے تو اسے اسی وقت نیند کی لذت گھیر لیتی ہے ۔ انا کا شعور اسے جگا بھی دیتا ہے لیکن

۱۔ ارمغانِ حجاز ، ص ۱۲۲/۱۰۰۴ ۔

اس پر جب بدن حاوی ہو جاتا ہے تو وہ محض سو ہی نہیں جاتا ، مر بھی جاتا ہے — یہ وہ مرحلہ ہے کہ جب آدمی روح اور ضمیر کی توبیخ سے بالکل بے نیاز ہو کر محض ہوس کی زندگی گزارنے لگتا ہے اور یہ بدقسمتی کی انتہا ہے ، ورنہ جب تک کش مکش باقی رہتی ہے یعنی ہوس اپنی جانب کھینچتی ہے اور ایثار کا جذبہ اپنی جانب بلاتا ہے ، خود پرستی لبھاتی ہے اور یاد خدا سجدے پر آمادہ کرتی ہے ، اس وقت تک آدمی جیتا رہتا ہے ۔ کبھی روح کا حکم مان لیا گیا ، کبھی بدن کا ، یہ کیفیت بڑی عذاب اور اضطراب کی کیفیت ہے مگر یہ روح کی موت نہیں ، یہ مقابلے اور مجاہدے کی زندگی ہے اور بے شمار افرادِ آدم کی حالت یہی ہے کہ وہ راہِ اعتدال سے محروم رہ جانے کے باعث اطمینان قلب کی دولت حاصل نہیں کر سکتے اور مرزا غالب کے شعرِ ذیل کی تفسیر بنے رہتے ہیں ۔

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر !
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

کوئی شخص کتنا ہی مہذب کیوں نہ دکھائی دے ، اس نے کتنا ہی خوبصورت لباس زیب تن کر رکھا ہو ، چہرے کی کتاب پر تبسم کے کتنے جمیل حواشی کیوں نہ لکھے ہوں اور گفتگو میں کتنے ہی ”حوالے“ پیش کرنے پر کیوں نہ قادر ہو اور اس کی عام معلومات کتنی ہی بے پایاں کیوں نہ ہوں ، اس سے ہرگز یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ ایک اچھا انسان بھی ہے ۔ ایک شخص بیک وقت علم کا بلند مینار اور کردار کی تاریک غار ہو سکتا ہے ، یہ کوئی محال امر نہیں ۔ ایک عیاش عالم و دانش ور ، ہر دم تن پروری اور زر اندوزی کی ترکیبات سوچتے رہنے والا ذہین و فطین آدمی اپنا کاروبارِ خود فریبی کتنا ہی وسیع کر لے بلکہ فنِ آدم فریبی میں کتنا ہی ماہر ہوجائے ، اندر سے محض وحشی انسان ہے ۔ اس کا کوئی اصول ، کوئی نظریہ اور کوئی دین ہو سکتا ہی نہیں ، اس لیے کہ منتشر شخصیت میں ضبط کہاں ، قاعدہ کیسا ؟ وہ تو در حقیقت حیوانی

سطح سے بلند ہو ہی نہیں سکا۔

Man must liberate himself from a bondage which is normal for animals and therefore evil for him (man) The soul of man demands a complete mastery over the flesh.[1]

اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ علمیت یعنی ذخیرۂ معلومات الگ شعبہ ہے اور انسانیت الگ شعبہ ہے۔ مثال کے طور پر اگر میں یہ کہوں کہ فلاں شخص نے تاریخِ تمدن کی بیسیوں ضخیم جلدیں جن کے مصنف بڑے پائے کے لوگ تھے، پڑھ رکھی ہیں، محض پڑھ ہی نہیں رکھیں بلکہ وہ انہیں پڑھا بھی سکتا ہے۔ للہذا ثابت ہوا کہ وہ بڑا نیک اور ہمدرد ہمسایہ ہے۔ فوراً پوچھا جائے گا کہ بھائی اس کا اس سے کیا تعلق؟ پھر اگر میں کہوں کہ فلاں شخص امریکہ سے جغرافیے کے فلاں شعبے سے متعلق فلاں فلاں اونچی ڈگری لے آیا ہے۔ لہذا ثابت ہوا کہ وہ وعدے کا بڑا پکا ہے؟ یا اگر میں یہ کہوں کہ میاں ا ب ج چونکہ ڈی لٹ یا ایف آر سی ایس ہیں۔ لہذا ثابت ہوا کہ بڑے محبِ وطن یا بڑے خادمِ خلق ہیں۔ تو کہا جائے گا کہ میاں اس کا اس سے کیا واسطہ؟ لیکن ستم یہ ہے کہ محض معلومات کو انسانیت کی سند نہ جاننے کے باوصف ہم لوگ جب کسی پڑھے لکھے سے کوئی غیر اخلاق اور غیر شریفانہ حرکت سرزد ہوتے دیکھتے ہیں تو یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ دیکھو اتنا پڑھا لکھا ہو کر حرکت کیا فرمائی ہے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں تو گویا یہ بھلا چکے ہوتے ہیں کہ تعلیم اور شے ہے اور تربیت اور شے۔

ع ''زندگی کچھ اور شے ہے علم ہے کچھ اور شے''

ہاں یہ ٹھیک کہ علم ذہانت کو چمکا دیتا ہے اور جو آدمی جتنا ذہین ہے اتنا ہی دوسروں کے مقابل اس امر کا زیادہ اہل ہے کہ مطالعہ و مشاہدہ سے مستفید ہو سکے، لیکن ساتھ ہی یہ بھی تو

---

1. Human Destiny by Le Compte Du Nouy (1956) P. 109.

ذہن میں رہنا چاہیے کہ اس کی ذہانت اسے انہی امور کی جانب متوجہ کرے گی جن کی طرف اس کی طبیعت کا رحجان ہو گا ۔ ذہین آدمی نے اگر تربیت ذات بھی کر رکھی ہو تو اس میں اپنی ذات سے بلند ہو جانے کی صلاحیت کم ذہین آدمی کے مقابل زیادہ ہوتی ہے ، اس کے برعکس وہی ذہانت زیادہ چمک کر ، زیادہ برندہ تلوار کی طرح غلط طور پر بھی استعمال کی جا سکتی ہے ۔ Human Destiny کا مصنف Le Compte Du Nouy لکھتا ہے کہ

"Intelligence alone is dangerous if it is not subjected to intuition or rational perception of moral values. It has led not only to materialism but to monstrosities."

بقول علامہ اقبال :

علم را بے سوز دل خوانی شر است !
نورِ آو تاریکیٔ بحر و بر است ![1]

سینہ روشن ہو تو ہے سوزِ سخن عینِ حیات
ہو نہ روشن، تو سخن مرگِ دوام اے ساقی ![2]

اور یہ بھی حضرت علامہ ہی کا ارشاد ہے کہ ـ ـ ـ ـ ـ "اگر طاقت اور قوتِ بصیرت سے محروم ہیں تو اس کا نتیجہ بھی بجز ہلاکت اور بےدردی کے اور کچھ نہیں ہو گا ۔ ہمارے لیے دونوں کا امتزاج ضروری ہے تا کہ عالمِ انسانی روحانی اعتبار سے آگے بڑھ سکے ۔"[3]

روحِ آدمیت سے محروم اور بے بہرہ علم و ذہانت کی قوت کے کرشمے ہم قومی اور بین الاقوامی سطح پر آئے دن دیکھتے رہتے ہیں ۔ مادہ پرستی کے اس دور نے اقدار کو جس طرح مسمار کیا ہے اس کا کچھ جلوہ دنیا کے سب سے بڑے رسمی ادارۂ اقوام کی کارروائیوں میں بھی دکھائی دیتا ہے ۔ وہاں دنیا کی تقریباً تمام اقوام کے چیدہ افراد مختلف ذمہ داریوں پر فائز ہیں ، وہ لوگ اپنے اپنے دائرہ عمل

۱- جاوید نامہ ، ص ۲۴/۶۶۲ -
۲- بالِ جبریل ، ص ۱۲/۳۰۴ -
۳- تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ ، ص ۱۳۸ -

کی نسبت سے اچھے خاصے پڑھے لکھے اور تجربہ کار لوگ ہیں — بڑے مہذب ، بڑے متمدن ، بڑے مدبر — اور وہ اپنے شعبوں سے متعلق بڑے علمی ، ذہنی اور فکری کمالات اور کرتب بھی دکھاتے ہیں لیکن کیا وہ فقط حق کے پرستار اور صداقت کے پاسدار ہیں ؟ کیا وہ خالص انصاف کی خاطر جمع ہوئے ہیں ؟ کیا یہ حقیقت نہیں کہ ان افراد میں سے تقریباً ہر ایک اپنی دانش کا کمال اس میں مضمر جانتا ہے کہ دروغ کو فروغ دے ؟ خود اس کے اہلِ ملک اور اس ملک کے حلیف اس سے یہی توقع رکھتے ہیں کہ وہ غلط شماریات اور غلط حقائق اور غلط دلائل کے زور سے اپنے لیے ناحق بھی چاہے اور دوسروں کو ان کے حق سے بھی محروم رکھے ۔ کیا وہ روشن خیال اور مدبر افراد فقط مظلوم کی پاسبانی کو پیشِ نظر رکھتے ہیں یا اپنے اور اپنے حزب یا اپنے حلیفوں کا مفاد پیشِ نظر رکھتے ہیں ؟ کیا بین الاقوامی سطح پر بھی ذاتی مصلحتیں حق و صداقت کا خون نہیں کراتیں ؟ نتیجہ یہ کہ جو جتنا حقائق کو مسخ کرنے پر زیادہ قادر ہو اُسے اتنا ہی بڑا مدبر قرار دیا جاتا ہے ، جو دروغ کا جتنا بڑا مینار استوار کر دے وہ اتنا ہی باوقار دانش ور اور روشن خیال سیاست دان اور عظیم نمائندہ تصور کیا جاتا ہے ۔ مخصوص مقاصد کے تحت اعداد و شمار میں ہیرا پھیری ، رودادوں اور رپورٹوں میں ہیرا پھیری ، دشمنی اور دوستی میں ہیرا پھیری ، امداد لینے اور امداد دینے میں ہیرا پھیری ، ظلم و عدوان کی تشریح و تاویل میں ہیرا پھیری و علی ہذاالقیاس ۔ دنیا کے اس عظیم ادارے نے پڑھ لکھے افراد کی ایسی ”روشن“ مثالیں پیش کر کے کیا اخلاق اور انسانی اقدار کو کوئی تقویت بخشی ؟ ان پڑھے لکھوں میں سائنس اور طب کے ماہر بھی ہیں ، سیاسیات ، تاریخ اور فلسفے کے عالم بھی ہیں ، ریاضیات و معاشیات بلکہ علم الاخلاق کے عالم و محقق بھی ہیں ۔ اگر وہاں سے انصاف کی آوازیں بلند ہوتیں ، مخصوص قومی اور حزبی چپقلش اور مصلحت انہیں مکر و فریب کے جال بننے پر مجبور

نہ کرتی تو اس سے اقدار کی تعمیر میں یقیناً مدد ملتی اور دنیا میں اصول پسندی اور حق شناسی کو فروغ نصیب ہوتا مگر منفی مسابقت نے اہلِ نظر اور حساس انسانوں کو مایوس کر دیا ہے - حق یہ ہے کہ آدمیت تک پہنچنے کے لیے بہت سی وحشتوں کو قربان کرنا پڑتا ہے اور محض علم کے زور پر اور محض فن اور ہنر کے بل بوتے پر آدمی آدمی نہیں بن جاتا -

علامہ اقبال کا تبصرہ کس قدر بجا ہے -

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزر گاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا

اپنی حکمت کے خم و پیچ میں اُلجھا ایسا
آج تک فیصلہ ٔ نفع و ضرر کر نہ سکا!

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا[1]

علامہ اقبال یوروپ کو شیطان کی کار گاہ اسی لیے کہتے ہیں کہ یوروپ نے مادہ پرستی کے نظریات کو فروغ دے کر اور چھینا جھپٹی کو تہذیب و تمدن کی علامت بنا کر پورے عالمِ انسانیت کو بنیادی قدروں سے محروم کر دینے میں بڑا پُر زور کردار ادا کیا ہے - بالِ جبریل میں علامہ اقبال نے لینن کی زبانی 'بحضور خدا' جو فریاد کی ہے وہ یوروپی تہذیب کے انسانیت کش مزاج کی بخوبی پردہ دری کرتی ہے - چند شعر ملاحظہ ہوں -

یوروپ میں بہت روشنی ٔ علم و ہنر ہے
حق یہ ہے کہ بے چشمہ ٔ حیواں ہے یہ ظلمات!

رعنائی تعمیر میں، رونق میں، صفا میں،
گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کی عمارات!

۱- ضربِ کلیم، ص ۶۹/۵۳۱ -

ظاہر میں تجارت ہے ، حقیقت میں جوا ہے
سود ایک کا لاکھوں کے لیے مرگِ مفاجات !

یہ علم ، یہ حکمت ، یہ تدبر ، یہ حکومت !
پیتے ہیں لہو ، دیتے ہیں تعلیمِ مساوات !

بے کاری و عریانی و مے خواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات ؟

وہ قوم کہ فیضانِ سماوی سے ہو محروم
حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات !

ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت !
احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات !!

وحی کی روشنی سے محروم علم و تدبر ''آدمیت احترامِ آدمی'' کا درس نہیں دے سکتا ، اور وہ انسان کو حیوانی سطح سے بلند نہیں کر سکتا ۔ آدمیت کی بنیادی قدروں سے محروم مدنیت میں منافقت کے سوا کیا ہو گا ۔ **اس** لیے کہ عمل علم کے پیچھے نہیں بلکہ یقین کے پیچھے چلتا ہے ، Action follows conviction and not knowledge یقین نہ ہو تو اندرونی انقلاب رونما نہیں ہوتا ، جو تبدیلی جلوہ گر ہوتی ہے وہ صرف رحجان کی وجہ سے ہوتی ہے ، محض علم سے کوئی انقلاب ظہور میں نہیں آتا ، ہاں اگر صاحبِ علم کا یقین مثبت ہے تو مثبت عمل ظہور میں آئے گا اور یقین منفی ہے تو منفی عمل ظہور میں آئے گا ۔ یقین کی صحت ضروری ہے اور وہ وحی کی روشنی کے بغیر ناممکن ہے ، یہ بحث شاید آگے چل کر بھی آئے۔

قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے ''افلم یسیروا فی الارض فتکون لھم قلوب یعقلون بھآ او اذان یسمعون بھا

۱- بالِ جبریل ، ص ۱۰۸/۴۰۰ ، ۱۰۷/۳۹۹ ۔

فانها لاتعمی الابصار ولکن تعمی القلوب التی فی الصدور"[1]

اس آیت میں کفار و مشرکین مکہ کی طرف اشارہ ہے جن کے تجارتی قوافل یمن میں پائے جانے والے آثار عاد و ثمود کو دیکھتے تھے اور شمال میں سدوم کی بستیوں کا نظارہ کرتے تھے مگر انہیں عبرت نہ ہوتی تھی ، اس لیے کہ آنکھیں تو تھیں مگر بینا نہ تھیں اور ان کی ''تنگیٔ چشم کثرت نظارہ سے بھی وا نہ ہوتی تھی''۔ آیت کا معنٰی ہے ''کیا یہ لوگ فرشِ زمین پر چلتے پھرتے نہیں ؟ پھر انہیں وہ دل میسر آ جانے چاہیئں تھے جن کی مدد سے یہ سوچ سمجھ سکتے اور وہ کان میسر آ جانے چاہییں تھے جن کی مدد سے یہ سن سکتے، اصل بات تو یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہو جاتیں وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں کے اندر ہیں۔'' اسی طرح قرآن نے نو مسلم بدوؤں کے ضمن میں وضاحت کی ہے ''قالت الاعراب امنا قل لم تؤمنوا ولکن قولوا اسلمنا و لما یدخل الایمان فی قلوبکم''[2] (یہ صحرا نشین بدو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ، کہہ دیں (اے رسولؐ) تم ایمان نہیں لائے ہو ہاں تم نے اسلام قبول کر لیا ، ابھی ایمان تو تمہارے دلوں میں اترا ہی نہیں) اقرار زبانی کا مطلب ہے کہ اصول تسلیم کر لیا گیا ، لیکن محض اصول کو تسلیم کر لینے سے کیا فرق پڑتا ہے ، شخصیت اور کردار پر تو اثر جب پڑے گا جب اصول قلب میں داخل ہو کر جزوِ جاں بنے گا ۔ یہی عالم علم کا ہے کہ اس کا وردِ زباں ہونا یا سرمایۂ دماغ ہونا الگ معاملہ ہے اور قلب میں اتر کر متاعِ جان بننا جدا مسئلہ ۔ ابو طالب کلیم کہتا ہے کہ دل اگر آگاہ نہ ہو اور زبان پر اللہ اللہ کا ورد رہے تو یہ بے سود بات ہے ، گداگر ہر دم اللہ اللہ کہتا ہے مگر وہ کاروبارِ زبان ہے ، معاملۂ دل نہیں ، یہ اللہ اللہ کرنا گداگر کی شخصیت پر مثبت

۱۔ قرآن کریم ۔ سورۃ ۲۲ ، آیت ۴۶ ۔

۲۔ ,, ,, ۔ سورۃ ۴۹ ، آیت ۱۴ ۔

اثر نہیں ڈالتا ۔

دل آگاہ می باید وگرنہ !!
گدا یک لحظہ بے نامِ خدا نیست[1]

علامہ اقبال کہتے ہیں :

تو عرب ہو یا عجم ہو ترا لا الہ الا !
لُغتِ غریب ، جب تک ترا دل نہ دے گواہی ![2]

علاجِ ضعفِ یقین اُن سے ہو نہیں سکتا
غریب اگرچہ ہیں رازی کے نکتہ ہائے دقیق ![3]

دین ہو ، فلسفہ ہو ، فقر ہو ، سلطانی ہو ،
ہوتے ہیں پختہ عقائد کی بنا پر تعمیر ![4]

صحیح معنوں میں علم اسی وقت علم بنتا ہے جب یقین کے درجے کو پہنچتا ہے ۔ اس طرح گویا بیرونی حقیقت اور اندرونی حقیقت ایک ہو جاتی ہے ، بلکہ یک جان ہو جاتی ہے ۔

"Knowledge is a response of the truth within to the truth without."[5]

قلب و دانش کی جدائی ، بالفاظ دیگر منافقت ، موجودہ جہانِ آدم کی شاید سب سے بڑی بیماری اور بدبختی ہے ۔ اشخاص کا ٹھوس تشخص ختم ہو چکا ہے ۔ مزاج منقسم ہیں ۔ خود اعتمادی غائب ہے گویا عالمِ انسانیت تجرید کا شکار ہے جس کا مظہر تجریدیت ہے ، مصوری تجریدی ، شاعری تجریدی ، نغمہ تجریدی ، رقص تجریدی ، شخصیتیں تجریدی ۔

۱۔ دیوانِ ابو طالب کلیم ، ص ۱۳۵ ۔
۲۔ بالِ جبریل ، ص ۳۳۷/۴۵ ۔
۳۔ ایضاً ، ص ۳۲۶/۳۴ ۔
۴۔ ضربِ کلیم ، ص ۶۰۶/۱۴۴ ۔
5. Personal Values in the Modern World I By M.V.C. Jaffreys (Ed : 1966) p. 143.

مصوری بھی صراحت سے خالی ، شاعری بھی یقین سے معرا ، نغمہ شور و غوغا کا اتار چڑھاؤ ، رقص Twist اور شخصیتیں بے مقصد و بے یقین و بے مراد ہیں ، جیسے آدمی آدمی نہ ہو بلکہ کسی غیر مفہوم خط کا حامل کوئی پھٹا ہوا لفافہ فٹ پاتھ پر پڑا ہو ، یا شاید کھوکھلے اور بے ربط ارشادات کا امانتدار کوئی سنگل شدہ ٹیپ ریکارڈر ہو ۔ ایسی شخصیتوں پر علوم کا بار لاد دیجیے وہی کیفیت ہوگی ، ''چار پائے برو کتابے چند''۔

وہ ہوا میں لٹکے ہوئے تنگ موری کے پاجامے کی طرح ہوا کے ہر رخ کے مطابق پینترا بدل لیں گے ، اُن کی ہوس اور ہوس کی پیدا کردہ بے اعتمادی کا عطیہ بزدلی اُن سے جو چاہے گی کرا لے گی ، وہ لوگ غلط بات کے بھی ''زندہ بادیئے'' ہیں اور صحیح بات کے بھی ''زندہ بادیئے'' ہیں ، کتابوں کی دو پاؤں پر چلتی رہنے والی الماریاں اور آوازوں کے گراموفون ۔ ہر بات کے بارے میں کوئی حوالہ پیش کر دینے والے میاں مٹھو ، خواہ وہ حوالے باہم کتنے ہی متضاد کیوں نہ ہوں ۔ چنانچہ ہر خیال و فکر کے حق میں یا مخالف بیان کی جانے والی رائے پر بے سوچے سمجھے سر دھننے والے مادی ہوس میں مقید تن پرست ، ایسے بے یقینوں کے بارے میں مولانا روم نے فرمایا تھا ۔

بستہ پائی چوں گیاہ اندر زمیں — سر بجنبانی بہ بادِ بے یقیں ![1]

''تم زمیں سے اُگنے والی گھاس کی طرح ہو جس کے پاؤں بندھے ہوتے ہیں اور جو ہر ہوا کے ساتھ بے سوچے سمجھے سر ہلاتی ہے ۔''
ایسے ہی بے قرار اور بے مدار اصحاب کے باب میں حضرت علامہ نے کہا تھا ۔

۱۔ محمد صادق رازی ، خلاصۂ مثنوی ، ص ۱۳ ۔

ازاں فکرِ فضا پیما چہ حاصل؟ کہ گرد ثابت و سیارہ گردد
مثالِ پارۂ ابرے کہ از باد بہ پہنائے فضا آوارہ گردد[1]

زندگی کے حقائق سے دور سیرِ فلک کرتے رہنے والے اور ستاروں اور سیاروں کے تعاقب میں محوِ پرواز رہنے والے فکر سے کیا فائدہ حاصل ہو گا، وہ فکر جو بادل کے کسی ٹکڑے کی طرح آسمان کی وسعتوں میں بے مقصد رواں دواں ہو۔

آج دنیا کے بیشتر حصوں میں اولادِ آدم اس المیے میں مبتلا ہے اور اس المیے کو بدستور بڑھاتی چلی جا رہی ہے، محض معاشی اصول اور ٹیکنالوجی کے پیدا کردہ خطرات ہی اس کا باعث نہیں۔ اگر عظمتِ آدم کا احساس کسی پختہ یقین کی طرح دلوں کو گرماتا رہتا تو عالم یہ نہ ہوتا، کچھ اس سے مختلف ہوتا۔ اپنے اندر جھانک کر دیکھنا اور آدم کی حیثیت سے ذمہ داری قبول کرنا، حالات کا غلام بن کر رہ جانے کے بجائے حالات کا فرمانروا ہونا وغیرہ مشقت طلب معاملات تھے۔ لہٰذا پڑھے لکھے لوگ، کھاتے پیتے گھروں سے تعلق رکھنے والے، جبلتوں کی ہر تمنا کو جوں کا توں بے اعتدال و توازن پورا کرنے والے اور ہوس کی ہر پیاس کو بے قاعدہ و نظام بجھا لینے والے لوگ جو بخیالِ خویش آزاد ہیں مگر حقیقتاً ان کی حالت کسی ڈور کٹی پتنگ سے مختلف نہیں جو فضائے بسیط میں ڈولتی پھرتی ہو۔ فیضانِ سماوی سے محروم تعلیم اور دے بھی کیا سکتی ہے؟

مدرسہ عقل کو آزاد تو کرتا ہے مگر
چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربط و نظام![2]

ایسے عالم میں جب کہ پڑھے لکھے اور متمدن و متمول گھروں کے لوگ بھی زندگی کو بے معنی جاننے لگیں اور احترامِ ذات کے

۱- ارمغانِ حجاز، ص ۹۸۱/۹۹ -
۲- ضربِ کلیم، ص ۵۴۳/۸۱ -

شعور سے محروم ہو جائیں تو دوسروں کا کیا احترام کریں ۔ اگر اولادِ آدم کے ایک فرد کی حیثیت سے ایک شخص خود آگاہ نہیں ، خود شناس نہیں تو وہ غیر آگاہ اور غیرشناس کیسے ہو گا ۔ بھائی کو بھائی کیسے مانے گا ، بہن کو بہن کس طرح تسلیم کرے گا ، تمام افرادِ آدم کو ایک کنبہ جاننا اور بسیط معنوں میں عظمتِ آدم کا قائل ہونا تو دور کی بات ہے ۔ لہٰذا خود کشی کی وارداتیں اور قتل و رہزنی ، زنا و اغوا محض معاشی تقاضے اور طبقاتی کش مکش کے معاملات نہیں ، اگر خود کشی فقط مسا کین ہی کرتے ، ڈاکہ فقط فقراء ہی ڈالتے ، قتل فقط بھوکے ننگے لوگ ہی کرتے اور متمول و فارغ البال ایسے جرائم سے پاک اور مبرا ہوتے اور خاص طور پر رزق و معاش کی طرف سے بے فکر تعلیم یافتہ لوگ ارتکابِ جرائم نہ کرتے تو ہم جان لیتے کہ بے راہ روی طبقاتی کش مکش کا نتیجہ ہے ، مگر ایسا نہیں ۔ زندگی کے مہمل ہونے کے احساس نے آدمی کو واپس حیوانیت کی طرف اور وحشیت و بہمیت کی طرف لے جانا شروع کر دیا ہے اور وہ اس کیفیت کو ''آزادی'' پر محمول کر کے منزلِ بربادی کی جانب بھاگا چلا جا رہا ہے ۔ لہٰذا وہ انسانیت کا درس دینے کو از منہ مظلمہ (Dark Ages) سے تعلق رکھنے والا فرد جانتا ہے ، بالفاظِ دیگر آدم بحیثیتِ آدم خود اپنی نظروں میں بے قدر ہو کر رہ گیا ۔

فسادِ قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب
کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف !

رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید
ضمیرِ پاک و خیالِ بلند و ذوقِ لطیف ![1]

ایسی تہذیب اگر انسانی معاشرے کا وہ پھل نہ قرار دی جائے جو گل سڑ چکا ہو تو کیا کہا جائے ، علامہ اقبال نے کچھ سمجھ ہی

۱- ضربِ کلیم ، ص ۷۱/۵۳۳ -

کے کہا تھا۔

خبر ملی ہے خدایانِ بحر و بر سے مجھے
فرنگ رہگذرِ سیلِ بے پناہ میں ہے!۱

یہ تجریدی شخصیتیں یعنی یہ ہپی حضرات و خواتین آخر کس تکلیف میں مبتلا ہیں؟ خود فراریت کے سوا اکثر و بیشتر کی آوارگی اور ناکردہ کاری کا محرک کیا ہے؟ اس خود بیزار اور خود آزار آدم نما مخلوق میں کثیر تعداد پڑھے لکھے لوگوں کی ہوتی ہے۔ ان میں فلسفے، نفسیات، ادب اور انجینیئرنگ کے منتہی بھی شامل ہوتے ہیں۔ یہ روٹی کی نایابی کے ستائے ہوئے اور مکان کی نایابی کے دوڑائے ہوئے لوگ نہیں، یہ جنسی بھوک کے باعث غریب الوطن نہیں ہوئے، یہ شادی کی تلاش میں بے گھر نہیں ہوئے بلکہ وہ محترمہ یا محترمات جن سے شادی کرنے کا کبھی کبھی وہم پڑتا ہے انہیں بھی ساتھ ساتھ افیون کھلاتے، چرس پلاتے اور ''راکٹ'' پر سوار کرائے ذلیل و خوار کیے پھرتے ہیں۔ مقامی ہپیوں سے ہٹ کر خاص طور پر یوروپ اور امریکہ سے آنے والے ہپیوں کو دیکھیے۔ کبھی کبھی وہ کہتے ہیں 'ہم تلاشِ سکون میں مشرق کی سمت چل دیے ہیں' ۔ سکون سے مراد نشے کی عطا کردہ سکونیت ہے۔ اگر انہیں اپنے گھر میں چرس اور بھنگ اتنی ہی آسانی سے مل جاتی جتنی ان نواح میں ملتی ہے تو وہ شاید مخصوص سکون گھر ہی میں پا لیتے۔ یہ تو واضح ہے کہ وہ ہمارے ممالک میں روحانی تسکین کی تلاش میں تشریف نہیں لاتے۔ انہیں معلوم ہے کہ ہم لوگ خود بھی روحانی اعتبار سے محروم ہو چکے ہیں۔ ہم ان کے لیے وہی روحانی مسکنات پیش کر سکتے ہیں جن کی تلاش میں وہ غریب الوطنی اختیار کرتے ہیں۔ ہاں، ان کی مزید خوشی کی خاطر خود اپنا حلیہ بھی انہی جیسا بنا کے ان کے ساتھ بیٹھ کر بڑے خلوص

۱۔ بالِ جبریل، ص ۳۶۱/۶۹۔

سے دھوئیں کا تبادلہ کر لیتے ہیں اور پھر بدن بھی تو دھواں ہی ہو کر رہ گئے ہیں۔ یہ بدن کے غلام اور جبلتوں کے محکوم افراد، اقدار کے مفہوم سے غافل اور مقامِ آدمیت سے نا آگاہ، چلتی پھرتی لاشیں، بقول حضرت علامہ:

کور ذوق و نیش را دانستہ نوش
مردۂ بے مرگ و نعشِ خود بدوش[1]

یہ لوگ جن کا ذائقہ مر چکا ہے، تمیز خیر و شر سے عاری، زہر کو شہد جاننے والے، موت آئی نہیں مگر اپنی لاشیں کندھوں پر اٹھائے پھرتے ہیں۔

اگر تجزیہ کیا جائے تو فقط ایک بات سامنے آئے گی جو ہپی حضرات و خواتین کی ہپیت کا باعث ہے اور وہ یہ ہے کہ روح بے چین ہے۔ جبلتوں کی تسکین روح کی تسکین نہیں۔ قرآن کا فیصلہ یہ ہے کہ ''الا بذکر اللہ تطمئن القلوب''[2] (ہاں، دیکھو کہ دلوں کو اطمینان یادِ خدا سے حاصل ہوتا ہے۔) خدا کے حوالے (Reference) کے بغیر ہر آگاہی نا آگاہی یا گمراہی ہے۔

کھلے ہیں سب کے لیے غریبوں کے میخانے
علومِ تازہ کی سر مستیاں گناہ نہیں!

اسی سرور میں پوشیدہ موت بھی ہے تری
ترے بدن میں اگر سوزِ لا الہ نہیں![3]

حضرت علامہ کے نزدیک علم کو بڑا تقدس حاصل ہے۔ وہ اس عقیدے کے مالک ہیں کہ دراصل علم کی جستجو جس رنگ میں بھی کی جائے عبادت ہی کی ایک شکل ہے اور اس لیے فطرت کا علمی

۱- زبورِ عجم، ص ۱۸۰/۵۷۲ -
۲- قرآن کریم - سورہ ۱۳، آیت ۲۸ -
۳- ضربِ کلیم، ص ۱۷۸/۶۴۰ -

مشاہدہ بھی کچھ ویسا ہی علم ہے جیسا حقیقت کی طلب میں صوفی کا سلوک و عرفان کی منزلیں طے کرنا[1]۔

آدم بھول گیا ہے کہ اس کا قلب اپنے مرکز کی طرف کھنچتا ہے اور یہ قلب ''و نفخت فیہ من روحی'' (میں نے آدم کے پتلے میں اپنی روح پھونکی) کا امانت دار ہے۔ اس قلب کو منکرِ خدا علم و دانش کے دبیز پردوں نے دبا لیا ہے اور وہ گھٹ کر رہ گیا ہے، اس کی مثال ایسی ہے کہ ہم میں سے کوئی شخص کسی نہایت ضروری مقصد کے لیے تیار ہو رہا ہو مگر وہ مقصد کسی جھنجھٹ کے باعث ذہن سے اتر جائے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بے چینی رہتی ہے۔ کبھی کوئی کتاب اٹھائی اور رکھ دی، کبھی ریڈیو لگایا اور بند کر دیا، کبھی یوں ہی چائے کی فرمائش کر دی، بنی تو کہا ٹھیک نہیں بنی واپس لے جائیے، کبھی بچوں کو ڈانٹ دیا، کبھی بیوی کو، کبھی آن کپڑوں کو برش کرنا شروع کر دیا جنہیں ابھی کئی روز تک نہیں پہنا جائے گا، بوٹوں کے تسمے کبھی ڈھیلے کر دیے کبھی کس دیے، کبھی کھڑکی کھولی کبھی بند کر دی، کبھی یہ احساس کہ روشنی زیادہ ہے، کبھی یہ کہ روشنی کم ہے، کبھی یہ غم کہ کمرے کی چھت بھدی ہے، کبھی یہ دُکھ کہ آسمان کا رنگ ہمیشہ نیلا رہتا ہے۔

حواس قائم ہیں، ذہانت سوئی ہوئی نہیں البتہ کھوئی ہوئی ہے۔ یہی عالم روح کا ہے، کسی جانب کی کشش ہوتی ہے مگر غفلت سدِ راہ رہتی ہے۔ پھر اگر روحِ بے تاب کا مالک ادھر آدھر ٹامک ٹوئیاں نہ مارے تو کیا کرے۔ حضرتِ علامہ نے بجا ہی تو کہا تھا۔

۱۔ تشکیل جدید الہیات اسلامیہ، ص ۱۳۷۔

ہے ذوق تجلی بھی اسی خاک میں پنہاں
غافل! تو نرا صاحبِ ادراک نہیں ہے![1]

آدمی کا بدنی اور روحانی ڈھانچہ جس طرح بنا ہے اس کا ہر تقاضا دیگر جملہ تقاضوں کے ساتھ متوازن اور متناسب ہو کر پورا ہونا چاہیے - بصورت دیگر اس کے منفی اثرات ظہور میں آنے لگتے ہیں یا اس تقاضے کا ترفع (Sublimation) عمل میں آ جائے مگر وہ ہزار میں کتنے افراد کو میسر آتا ہے - اسی طرح روح بھی تشنہ رہے تو اپنی کارفرمائی کے لیے منفی ذرائع تلاش کرنے لگتی ہے - بہرحال اس ذوقِ تجلی کی مستوری نے آدمی کو روحانی رفعتوں سے محروم کر دیا اور جب روحِ لطیف دب کر اور بے جان ہو کر رہ گئی تو بدن بھی محض ملبہ بن گیا یا محض مشین - اس کا علاج یہی ہے کہ دلوں کو پھر سے ان کے اصلی مصدر اور محور کی طرف راغب کیا جائے تا کہ ٹامک ٹوئیاں ختم ہوں، اس کے بغیر عرفانِ ذات مکمل نہ ہوگا - علامہ اقبال کہتے ہیں کہ یوروپی علوم کی بدبختی یہی ہے کہ عناصر پر قدرت تو بڑھتی جا رہی ہے مگر قلب خالی ہوتا جا رہا ہے اس لیے کہ اس تعلیم کا رُخ بھی اور مصدر بھی خدا کے Reference سے محروم ہے - حضرت موسیٰؑ سمندر چیر کر وادیٔ طور میں وارد ہوئے تھے - یوروپ کا صاحبِ دانش سمندر چیر کر اور پھر حیران ہو کر رہ جاتا ہے -

از کلیمے سبق آموز کہ دانائے فرنگ
جگر بحر شگافید و بہ سینا نرسید[2]

قدحِ خرد فروزے کہ فرنگ داد ما را
ہمہ آفتاب لیکن اثرِ سحر ندارد![3]

۱- بالِ جبریل، ص ۳۲۵/۳۳ -
۲- زبورِ عجم، ص ۴۸۲/۹۰ -
۳- ایضاً، ص ۴۴۹/۵۷ -

خرد افزود مرا درسِ حکیمانِ فرنگ،
سینہ افروخت مرا صحبتِ صاحب نظراں![1]

لہٰذا ضروری ہے کہ دل کافر کا رُخ دوبارہ اس کے مرکز کی جانب کردیا جائے اور پھر کائنات کو نئے سرے سے دیکھا جائے، اس طرح کہ گویا پہلے کبھی نہ دیکھا تھا، جو کچھ پڑھا ہے وہ غلط تھا یا صحیح اس، پر نئے سرے سے نظر ڈالنا ہوگی، کچھ جو پڑھا ہے وہ بھلانا ہوگا اور کچھ جو نہیں پڑھا وہ پڑھنا ہوگا۔ یہ اپنی نظر اور اپنی ہی نظر سے دیکھنا اس وقت تک میسر نہیں آتا جب تک آدمی کا اندرون روشن اور بیدار نہ ہو اور خود آگاہی کی دولت دستیاب نہ ہو۔

کافر! دل آوارہ دگر بارہ باو بند
برخویش کشادیدہ و از غیر فروبند!
دیدن دگر آموز و ندیدن دگر آموز![2]

نیز یہ کہ:

بہ آں مومن خدا کارے ندارد | کہ در تن جان بیدارے ندارد
ازاں از مکتبِ یاراں گریزم | جوانے خود نگہدارے ندارد[3]

تحصیلِ علوم سے اکتسابِ زر کے بھی در کھلتے ہیں، بجا، مگر اس کا واحد مقصود زراندوزی نہ تھا، برتر مقصود تعمیرِ کردار اور اصلاحِ اخلاق تھی۔ صاحبِ کشف الظنون کا قول ہے ''فالعلوم لیس الغرض منہا الاکتساب بل الاطلاع علی الحقائق و تہذیب الاخلاق''[4]۔ علوم سے کمائی ہی مراد نہیں، اس سے مراد حقائق سے آگاہ ہونا اور اخلاق سدھارنا ہے اور

۱- پیامِ مشرق، ص ۱۳۵/۳۱۵ -
۲- زبورِ عجم، ص ۷۹/۴۷۱ -
۳- ارمغانِ حجاز، ص ۹۸/۹۸۰ -
۴- التربیۃ و التعلیم فی الاسلام: دارالعلوم للملائیین بیروت، ص ۱۴۴ -

اہلِ علم تعلیم دیتے وقت اخلاق و کردار کی تعمیر سے غافل نہ رہتے تھے ۔ حضرت حسن بصریؒ کا قول مشہور ہے "لولا العلماء لصار الناس مثل البہائم" (اگر اہلِ علم نہ ہوتے تو لوگ حیوانوں کے سے ہو کر رہ گئے ہوتے) گویا عالم شخص کو مکارمِ اخلاق کا اعلیٰ نمونہ ہونا چاہیے تھا تاکہ اس کی مثال دوسروں پر اثر انداز ہو اور دوسرے اس کے کردار کو دیکھ کر اپنا کردار سنواریں کیونکہ عام آدمی مزاجاً نقال ہیں ، وہ اہم آدمیوں کو جیسا دیکھتے ہیں کوشش کرتے ہیں ، خواہ وہ کوشش شعوری ہو یا غیر شعوری کہ ویسے ہی بنیں ۔ گھر میں باپ ، ماں اور بڑے بہن بھائی ، پھر مدرسے میں استاد اور سینئر طالب العلم اپنے سے چھوٹوں کے طرز پر اثر ڈالتے ہیں ۔

اُمتِ مسلمہ کا اخلاقی ڈھانچہ صدہا سال بحال رہا ، وہ اس لیے کہ ہر زمانے اسے کثیر تعداد میں بے لوث معلم میسر آتے رہے جو بے مزد و معاوضہ روشنیٔ علم بھی پھیلاتے تھے اور تہذیبِ کردار و اخلاق کا فریضہ بھی ادا کرتے تھے ۔ ہماری ملت کے اکابر صوفیہ اور فقرا کا سب سے بڑا وصف یہ تھا کہ وہ معلم تھے ۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی بعد رسالت جو وصف اللہ نے بیان کیا وہ یہی تھا کہ آپؐ لوگوں کو علم و حکمت عطا کرتے ہیں ، پہلے ان کے قلوب کو آلائشوں سے پاک و صاف کرتے ہیں اور پھر ان قلوب میں علم و حکمت کی شمعیں سجا دیتے ہیں ، "یتلو علیہم آیٰتہ و یزکیہم ویعلمہم الکتاب والحکمۃ"[۱] ۔ ہاں تو ملت کے اکابر صوفیہ و فقرا چوٹی کے عالم بھی تھے اور صاحبِ تصنیفات بھی ۔ حضرت حسن بصریؒ ، جنید بغدادیؒ ، محی الدین عبدالقادر جیلانیؒ ، شہاب الدین سہروردیؒ ، علی ہجویریؒ (داتا گنج بخش) ،

۱۔ قرآن کریم ۔ سورہ ۳ ، آیت ۱۶۴ ۔

،، ،، ۔ سورہ ۶۲ ، آیت ۲ ۔

بہاء الدین نقشبندؒ ، شیخ سرہندیؒ وغیرہم سب عالم لوگ تھے۔ وہ لوگ سیاحت میں رہتے تھے تو محض مطالعۂ کائنات نہ کرتے تھے بلکہ جہاں سے گزرتے تھے پڑھتے اور پڑھاتے جاتے تھے، جہاں بیٹھتے تھے درسِ علم و اخلاق کا دبستان کھل جاتا تھا ، یہ بے نیاز اور مستغنی المزاج اہلِ علم اور صوفیہ مسلمانوں کی مجلسی زندگی کے لیے ریڑھ کی ہڈی کا حکم رکھتے اور حق یہ ہے کہ مسلمانوں نے بادشاہوں سے بڑھ کر درویش مزاج علماء و صوفیہ کی قدر کی ۔ مسلم ملت نے بادشاہوں کو برداشت ضرور کیا ، ان کی ملازمت بھی لاکھوں نے کی لیکن ان کی ارادت و محبت کا مرکز علماء و دراویش ہی رہے ۔ یہ منظر مامون و متوکل نے بھی دیکھا ، محمد تغلق اور علاء الدین خلجی نے بھی اور اکبر و جہانگیر نے بھی ۔ اس زاویۂ نظر سے مسلمانوں کی تاریخ کا از سرِ نو مطالعہ بڑا دلچسپ بھی ثابت ہوگا اور حوصلہ افزا بھی ۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ جو درویش یا عالم شاہوں اور درباروں کا طواف کرنے لگتا تھا وہ لوگوں کی نظروں میں بے وقار ہو جاتا تھا اور جو بادشاہ یا حاکم و امیر دراویش کی بارگاہ میں حاضر ہوتا تھا اس کی عزت لوگوں کی نظروں میں بڑھ جاتی تھی ۔ آج بھی اہلِ حکم عامۃ المسلمین کی عقیدت حاصل کرنے کے لیے خانقاہوں کی زیارت کرنے ، چادریں چڑھانے اور دروازے نصب کرنے چل کھڑے ہوتے ہیں ، اور آج بھی جس عالمِ دین یا سجادہ نشین کے بارے میں یہ احساس ہو جائے کہ وہ شاہ دوست اور جاہ پرست ہے اس سے نفرت سی ہونے لگتی ہے اور اس کا تمام علم بے معنٰی ہو کر رہ جاتا ہے ۔

صوفیہ اور فقراء کی مصلحانہ و معلمانہ کوششوں کے شانہ بشانہ وہ لوگ بھی جابجا موجود تھے جو اپنے اپنے نواح میں عالمانہ شہرت کے مالک تھے ۔ وہ اپنی روزی کے لیے تجارت ، زراعت ، صنعت و حرفت کا سہارا لیتے تھے اور فارغ اوقات میں مفت تعلیم دیتے تھے ۔ ان کے گھر طالبانِ علم کے لیے مدرسے تھے اور ایسے گھر ہر بڑے

شہر اور قصبے میں موجود تھے - دوسروں کو علم کے زیور سے آراستہ کرنا اور انہیں بہتر انسان بنانے کے لیے وقت کا ایثار کرنا ان کے نزدیک کارِ ثواب بھی تھا اور اجتماعی ذمہ داری بھی - ڈاکٹر محمد اسد طلس نے اپنی کتاب "التربیة والتعلیم فی الاسلام" میں ذکر کیا ہے کہ جب نظام الملک نے بغداد کی سرکاری یونیورسٹی قائم کی اور تنخواہ دار ہمہ وقتی استاد ملازم رکھے تو علمائے خراسان نے ماتم علم کی مجلسیں منعقد کیں اور کہا کہ "معلمی" بلند نظر اور پاک نفس لوگوں کا شیوہ تھا جن کے پیشِ نظر علم کے ذریعے بزرگی و کمال کا حصول ہوتا تھا مگر اب جو علماء آئیں گے وہ علم کو محض کمائی کا ذریعہ بنائیں گے اور تنخواہ کے خیال سے دُون نہاد اور نکمے افراد بھی اس جانب کا رُخ کرنے لگیں گے -"[1]

گویا معلمی ایک خاص مزاج کا نام تھا جس میں درویشی اور بے نیازی حاوی عنصر کی حیثیت رکھتے تھے - بہرحال بہت سے مسلم علماء نے تنخواہ دار معلمی کرنے کے باوصف فارغ اوقات میں بلا معاوضہ درس دینا ترک نہ کیا اور یہ سلسلہ آج سے کوئی تہائی صدی قبل تک جاری تھا - ٹھیک ہے کہ آج حالات بدل گئے ہیں - آج کی تعلیم اتنی پُرپیچ ہو گئی ہے کہ وہ وسیع معملوں کے بغیر اور بھرپور لائبریریوں کے بغیر عمل میں نہیں آتی ، لیکن وہ بزرگانہ شفقت جو بچوں کو ابتدائی تعلیم اور بڑوں کو تاریخ ، اخلاق ، دین ، فلسفہ اور ادب وغیرہ کی تعلیم دے سکتی ہے کیوں ناپید ہو گئی اور وہ ایثار کیوں باقی نہ رہا ۔ ڈیوی (Dewey) کہتا ہے کہ ہر مفکر فرد سوسائٹی کے لیے تعمیرِ نو کے مرکز کی حیثیت رکھتا ہے[2]- اس لیے کہ خالی علم حاصل کرکے اور معلومات کا ذخیرہ بڑھا کے افرادِ بشر

۱- التربیة و التعلیم فی الاسلام ، بیروت - ص ۱۲۶ -

2. Man, Self and Society I Introduction, p. xxv (Ed. 1959 Chicago)

کسی اچھی مثال اور روایت کو فروغ نہیں دے سکتے جب تک خود ان کی اپنی شخصی اور ذاتی اصلاحِ کردار عمل میں نہ آئے اور زندگی اور عالمِ انسانیت کے بارے میں ان کا رویہ ہمدردانہ اور مشفقانہ نہ ہو۔ بقول علامہ اقبال۔

ادب ، پیرائیہ نادان و دانا ست
خوش آں کو از ادب خود را بیار است

ندارم آں مسلماں زادہ را دوست
کہ در دانش فزود و در ادب کاست !!

رہا وہ شعبۂ زندگی جسے معلمی کہتے ہیں تو اس کا ایک مخصوص مزاج تھا جسے بے نیازی اور درویشی کہتے تھے ۔ وہ مزاج معلم کو شہنشاہ بنائے رکھتا تھا ۔ آج حالات کے تقاضے بدل گئے ہیں ، مادی مجبوریاں بڑھ گئی ہیں ، بالکل بجا ، لیکن اس کے باوصف کیا ترجیحات خود اپنی جگہ حقیقت ہیں یا نہیں ؟ معلم کی ترجیح یہ ہونی چاہیے کہ وہ کمائی کو اپنے بہیمی وجود کی عیاشی اور نخوت و جاہ کی پرورش کے لیے نہ بڑھائے بلکہ درویشانہ روش اختیار کرتے ہوئے اپنے اکتسابِ زر کو مزید علمی اکتساب کے لیے وسیلہ بنائے۔ مگر دنیائے حال کے مزاج کا عمومی اثر یہ ہے کہ معلم بھی اپنے حلقۂ عمل کو ایک فیکٹری یا تجارتی کارگہ جانتا ہے اور زیادہ سے زیادہ رقم اکٹھی کرکے دنیا داروں کے شانہ بشانہ ٹھاٹھ اور دکھاوے کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے ۔ لٰہذا تحصیل و تحقیق کے حق میں جس خلوص کی ضرورت تھی وہ نمود و نمائش اور Window Dressing پر صرف ہونے لگی ، چنانچہ آج وہ مزاج اور رویہ جسے اساتذہ اور معلمین سے منسوب کیا جانا چاہیے تھا ناپید ہوگیا ہے ۔ چمک دمک کا رسیا اُستاد ، وہ استاد جو بس چلے تو حضرتِ اکبر کے شیخ کی

۱- ارمغانِ حجاز ۔ ص ۹۸۱/۹۹ ۔

طرح اندھیرے اُجالے میں چُوکتا بھی نہیں ، خود تربیت سے محروم، اور ظاہر ہے کہ جو خود گُم راہ ہو وہ دوسروں کی کیا رہبری کرے - ع

آنکس کہ خود گم است کرا رہبری کند

جس استاد کی اپنی شخصیت ایک خاص دلکش اور جاذب سانچے میں نہیں ڈھلی وہ اپنی مثال سے شاگردوں کی کیا تربیت کرے گا - حالانکہ تربیت صرف لفظوں سے نہیں ہوتی ، وہ کردار ہے جو پورے وجود سے ہر ادا کی شکل میں جھلکتا ہے - اسی کو علامہ اقبال فیضانِ نظر کہتے ہیں - کسی کا قول ہے ''من لاینفعک لحظہ لاینفعک لفظہ''[۱] (جس کی نگاہ تجھے فائدہ نہیں دیتی اس کے الفاظ بھی تجھے کوئی نفع نہیں دیتے -) شخصیت میں اگر اخلاص ہے ، اگر قلب دردمند اور شفیق ہے ، اگر نیت میں خیر گستری ہے تو آنکھوں میں سے تاثیر کی شعاعیں پھوٹتی رہتی ہیں -

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں
ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں[۲]

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیل[۴] کو آدابِ فرزندی[۳]

لہٰذا اگر علامہ اقبال اہلِ مدرسہ سے بدظن تھے تو اس کے لیے وجہ جواز موجود تھی ، پھر جب استاد کی مثال کارساز نہ رہی تو استاد شاگرد کا معاملہ کچھ اس طرح کا ہو کر رہ گیا ہے گویا کوئی بڑی کتاب کسی چھوٹی کتاب کو پڑھا رہی ہو - آدمی دونوں کے بیچ میں سے ہو کر نکل گیا ہے اور صاف بچ کر نکل گیا -

---

۱- عوارف المعارف، عبدالقاہر بن عبداللہ السہروردی، دارالکتاب العربی بیروت - ص ۱۲۰ -
۲- بال جبریل ، ص ۳۳۹/۴۷ -
۳- ایضاً ، ص ۳۰۶/۱۴ -

ستم بالائے ستم یہ کہ استاد جیسا کچھ بھی باقی رہ گیا ہے اسے دوسرے تعلیمی اور اطلاعی وسائل نے کہیں کا نہیں رہنے دیا۔ پرانے زمانے کا استاد بسم اللہ کے گنبد میں محفوظ و مامون اظہار رائے کرتا تھا اور اس کا ایک دبدبہ اور رعب ہوتا تھا۔ بقول W. E. Porter :

"It was a self-sealed world and in it the teacher was a commanding figure, as a source of certain kinds of information, he was without a Peer.[1]

اب استاد (جیسا بھی وہ ہے) کی حیثیت یہ ہے کہ اس کا بتایا ہوا اور سمجھایا ہوا کوئی مسئلہ جوں کا توں نہیں رہتا۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن اور فلم کی اپنی ترجمانی اور تلقین ہے، فلمی رسالوں کی اپنی ''ترغیبات'' ہیں، رنگ رنگ کے نفسیاتی اور جنسی رسائل و جرائد کی اپنی تبلیغ ہے، چنانچہ استاد کا رہا سہا وجود بھی تحلیل ہو کر رہ گیا ہے۔ امریکہ میں طلبہ کا نیند کے بعد سب سے زیادہ وقت ٹی وی دیکھنے میں صرف ہوتا ہے[۲]، اور اعداد و شمار سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ بچوں کو ہر پروگرام سے زیادہ پسند مار دھاڑ اور جرائم والے پروگرام ہیں۔[۳]

اگر حالت یہ ہو تو اخلاق سدھارنے کی ذمہ داری سر تا سر استاد کے سپرد کی بھی کیسے جا سکتی ہے۔ اس ضمن میں بچوں کے والدین کو بھی پوری توجہ صرف کرنی چاہیے، اس لیے کہ جو بچے گھر میں نظم و ضبط کی تاکید سے محروم رہتے ہیں وہ سکول اور کالج میں بھی اساتذہ کے لیے دردِ سر بنے رہتے ہیں۔ ماہرینِ نفسیات کے

---

1. Educational Issues in a Changing Society, Edited by Keiber and Smith (1964) p. 68.

۲۔ ایضاً، ص ۵۹۔

۳۔ ایضاً، ص ۶۳۔

خیال میں بچہ تین ماہ کی عمر سے سیکھنا شروع کر دیتا ہے - ایسے والدین بچوں پر ظلم کرتے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ بچوں کو منع نہیں کرنا چاہیے وہ جو کرنا چاہیں انہیں کرنے دینا چاہیے - اپنے گھر میں چیزیں توڑنے کا شائق بچہ دوسروں کے گھر جا کر بھی وہی شوق پورا کرنا چاہتا ہے - بچے نرم شاخوں کی طرح جھکائے اور موڑے جا سکتے ہیں مگر جب وہ بڑے ہو کر موٹے ٹہنوں کی طرح سخت ہو جاتے ہیں تو پھر انہیں جھکایا اور موڑا نہیں جا سکتا ، فقط توڑا جا سکتا ہے -

لڑکوں اور لڑکیوں کے بالوں ، کپڑوں اور جوتوں کی وضع اور مزاج کی بے لگامی سب کچھ والدین کے سامنے ہے - اس کا مطلب یہ ہے کہ یا تو والدین خود بھی اسی انداز کے ہیں ، یا غافل ہیں یا بے بس - بے بسی کی کئی وجوہ ہیں جن میں ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ والدین نے اولاد کے سامنے کسی اچھے کردار کا مظاہرہ نہیں کیا اور کوئی اچھی مثال پیش نہیں کی ، ورنہ گھر کی ہر دم زندہ اور اچھی مثالیں انہیں بے راہ رو ہونے سے ایک حد تک تو ضرور روکتیں - بچے والدین کے قول و فعل میں تضاد دیکھتے ہیں ، لہٰذا والدین کے وعظ سے کوئی اثر قبول نہیں کرتے - بارہا ابا جان نے گھر میں ہوتے ہوئے بچوں سے کہا ہو گا کہ باہر سے آواز دینے والے سے کہہ دو کہ ابا جان گھر پر نہیں ، بارہا امی جان نے سچ بولنے کی تلقین کرنے کے باوصف بچوں کو ان کے باپ کے پاس جھوٹا گواہ بنایا ہو گا - اگر گھر میں بزرگ رشتہ دار صداقت و امانت کی مثال نہ بنیں تو بچے کیا سیکھیں ؟ اگر فیضانِ نظر گھر سے نہ چلے تو مکتب کی کرامت بھی مشکل ہی سے جلوہ گر ہوتی ہے - والدین کو اگر اولاد کی تعلیم کا غم لاحق رہتا ہے تو ان پر لازم ہے کہ تربیت کا خیال بھی رکھیں اور اس کے لیے اپنے آپ پر بھی کچھ پابندیاں عائد کریں تا کہ بچوں کے لیے نظم و ضبط اور حق و صداقت کا ایک قابلِ تقلید نمونہ بن سکیں - مگر یوروپ کی تعلیم نے ، خصوصاً وہ تعلیم جو یوروپ والوں نے مشرق میں

رائج کی ، خود والدین ہی کو جدید سانچوں میں ڈھال دیا ، آگے جو اولاد ہوئی اسے مزید ''ترقی پسند'' ہونا ہی تھا ۔ چنانچہ اقدار ملیامیٹ ہوئیں ۔ ضمیر بے جان و بے روح ، حیا غائب ، نوجوان مرد عورتوں کی طرح تن کی تزئین میں مصروف ، عورتیں شوخ چشم اور ظنار ، رئیس عیاش اور بیدرد ، خدا سے دور اور اپنی خود مرگ کے شعور سے بھی محروم ،

وائے قومے کشتۂ تدبیر غیر
کارِ او تخریبِ خود ، تعمیر غیر

نقش حق را از نگینِ خود سترد
در ضمیرش آرزوہا زاد و مرد

بے نصیب آمد ز اولاد غیور
جاں بہ تن چوں مردۂ در خاکِ گور

دختران او بزلفِ خود اسیر
شوخ چشم و خود نما و خردہ گیر

منعمانِ او بخیل و عیش دوست
غافل از مغزاند و اندر بندِ پوست

آہ قومے دل ز حق پرداختہ
مرد و مرگِ خویش رانشناختہ[۱]

بدلتی ہوئی سوسائٹی میں جب ذہنی افراتفری عام ہو جائے تو قومی تربیت کی ذمہ داری ہر اُس فرد پر عائد ہوتی ہے جو کسی بھی اعتبار سے اہمیت کا مالک ہو ، خاص طور پر سیاسی رہنماؤں کو جنہیں لاکھوں بلکہ کروڑوں کے سامنے جلوہ گر ہونا ہوتا ہے ۔ اگر وہ افراد جنہیں ملک و ملت کی سیاسی و آئینی راہبری اور حفاظت کرنا ہے تدبر اسی کو جانیں کہ دوسروں کے سچ کو جھوٹ ثابت

۱- پس چہ باید کرد ۔ ص ۱۶/۸۱۲ ، ۱۵/۸۱۱ ۔

کریں اور جھوٹ کو سچ ، اور جن کی اپنی ذات قول و فعل کی مسلسل خانہ جنگی کا مظہر ہو وہ قومی اخلاق کو مستحکم کرنے کے بجائے مزید کھوکھلا کر دیتے ہیں ۔ غیر ذمہ دارانہ باتیں بچوں پر خاص طور پر جلدی اثر کرتی ہیں اور وہ بعجلت تمام نقالی پر آتر آتے ہیں ۔

مغربی مفکرین بھی جن کے یہاں مادہ پرستی نے انسانی اخلاق کو ملیا میٹ کر کے انسان کو تباہی سے ہکنار کر دیا ہے ، آخر اس نتیجے پر آن پہنچے ہیں کہ اگر عالمِ انسانیت کو کامل بربادی سے بچانا مقصود ہے تو عالمِ انسانیت کو اخلاقی اقدار پر استوار کرنا ہو گا اور اخلاقی اقدار کی بنیاد و نہاد اس کے سوا کیا ہے کہ آدمی آدمی کا احترام کرنا سیکھے ۔ عظمتِ آدم کے شعور کے بغیر کوئی اخلاقی ڈھانچہ تعمیر کیا ہی نہیں جا سکتا ۔

M.V.C. Jaffreys کے بقول ۔

''If we consider what should be the basic motive for responsible moral behaviour, we have to remind ourselves that the ground of all morality is respect of person for person.''[1]

آدمیت احترامِ آدمی   با خبر شو از مقامِ آدمی ![۲]

اور پھر اخلاقی تعلیم شاملِ نصاب ہونی چاہیے جس میں محض نصیحت کے کلمات کے بجائے بلند تر ، عالی ہمت ، انسان دوست اور ایثار کیش شخصیتوں کے احوال و سوانح دیے جائیں ، اس لیے کہ سب سے بڑی تلقین مثال ہے ۔

یوروپ کی ذہنی فضا کا تجزیہ کیا جائے تو چلتے چلتے ہم یونانی دیو مالا تک جا پہنچتے ہیں ، جہاں کے دیوتا انسانی روپ میں

---

1. Personal Values in the Modern World (1966) p. 135.

۲- جاوید نامہ : ص ۹۳/۲۰۵ ۔

عظمت و صولت کے مالک بھی تھے اور انسان کی ہر کمزوری کا زور دار عملی نمونہ بھی ۔ Will Durant نے Menippus کے حوالے سے لکھا ہے کہ جب اس نے Hesiod اور Homer کی کہانیوں میں بیان کردہ دیوتاؤں کے کردار کی رُوداد سنی تو بولا ۔

"........ Adultrous Gods, rapacious Gods, violent litigious incestuous Gods. I found it all quite proper and indeed, was intensely interested."[1]

حق یہ ہے کہ ہومر اور ہیسیڈ نے ان دیوتاؤں کو یوروپ کی نفسیات میں شامل کر دیا ۔ جب یوروپ کے فلسفیوں نے اخلاق کی طرف توجہ کی تو اسے عمل کے بجائے فلسفے کا ایک مسئلہ بنا کے چھوڑ دیا اور آج تک کہ بیسویں صدی کا تین چوتھائی جا چکا ہے فلاسفۂ اخلاق خیروشر اور معروف و منکر کی تعریف و تحدید نہیں کر سکے ۔ کوئی فلاسفر کسی دوسرے فلاسفر سے کاملاً متفق نہیں ہوتا ، ویسے بھی فلاسفہ کا کام تو سوچنا ہے ، وہ اپنی سوچ ، اپنی فکر اور دقیقہ رسی کے نتائجِ حسب ہمت و توفیق بیان کر دیتے ہیں ۔ وہ عمل کی ذمہ داری دوسروں پر ڈال دیتے ہیں ۔ چند مثالوں کو چھوڑ کر فلاسفہ خود اپنی تعلیمات کے عملی نمونے کم کم ہی بن سکے ، پھر کس کی شخصی مثال کو سامنے رکھا جائے؟ کس کی بیان کردہ خیر کو قبول کیا جائے اور شر کو رد کر دیا جائے؟

مسلمانوں کے لیے یہ مسئلہ نسبتاً آسان رہا ۔ وہ یوں کہ خیروشر اور معروف و مُنکر کی محض لمبی چوڑی تعریفیں کرنے کے بجائے وہ دیکھتے ہیں کہ جس کام کے کرنے کا خدا نے حکم دیا ہے وہ معروف اور خیر ہے اور جس سے منع کیا ہے وہ منکر اور شر ہے ، اس لیے کہ آدمی تا حال اپنے جغرافیۂ ذات سے بخوبی آگاہ نہیں ہو سکا ۔ ابھی تک وہ اپنی روحانی بلندیوں اور پستیوں ، لطافتوں اور

---

1. Caesar and Christ, published by Simon and Schuster (New York) p. 495.

کثافتوں کی تہ تک نہیں پہنچ سکا ۔ وہ شعور و وجدان کے فرق سے بخوبی واقف نہیں اور اگر تاحال وہ اس مشینری کو جان ہی نہیں سکا تو اس کے بارے میں حتمی ضابطے اور قاعدے اور احکام کیونکر مرتب کر سکتا ہے؟ صحیح حکم اور فیصلہ تو اسی کا ہے جو اُسے جانتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس کے خالق سے بڑھ کر اسے کون جان سکتا ہے؟

وہی جانتا ہے جس نے پیدا کیا اور اسی نے نورِ ہدایت نازل کیا اور اس ہدایت کے باب میں مکمل اور احسن نمونہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کے روپ میں اولادِ آدم کے اوپر نازل فرمایا ۔ اگر فرشتے آتے اور آ کے قرآن مکہ مکرمہ کے کسی چوک میں رکھ جاتے اور جاتے ہوئے اعلان کر جاتے کہ یہ آئین انسانیت ہے جو خدائے تعالیٰ نے خیرو فلاحِ انسانیت کے لیے ارسال کیا ہے، اسے پڑھو اور پھر اس کی روشنی میں ہر قانون اور ضابطہ وضع کر لو اور پھر اپنے معاشرے کو اس قانون اور ضابطے کی حدود میں رکھ کر استوار کر لو ۔ اگر ایسا ہوتا تو ارکان دین کی صورت بصراحت سمجھ میں نہ آتی ۔ لوگ پڑھتے رہتے مگر اعمال کا تعین ان سے ممکن نہ ہوتا ۔ ایسے عالم میں ایک خاص انداز کا معاشرہ کیونکر وجود میں آ سکتا تھا؟ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی مثال نے قرآن کے معانی و مفاہیم دلوں میں اتار دیے اور اس طرح قرآن ان کی زندگی بن گیا ۔ للہذا یہی نہیں کہ فقط ملتِ مسلمہ کو شدید ضرورت ہے کہ بچوں اور جوانوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور حضورؐ کے اسوۂ حسنہ کے اتباع میں تربیت پانے والے بزرگوں کے سوانح اور احوال سے آگاہ کرے بلکہ یہ پوری دنیائے انسانیت کی ضرورت ہے ۔ اس وقت اولادِ آدم بے کرداری، بے اخلاقی اور بے آدابی کے بے پناہ کرب اور عذاب میں مبتلا ہے ۔ مادہ پرستی نے اسے ہوس کا بے رحم پتلا بنا کر رکھ دیا ہے ۔ وہ تن پرور ہے اور اس کا علم اسے کوئی فائدہ نہیں دے رہا ۔

اے بجانت لذت ایماں حرام اے پرستار بتان سیم خام
قیمت روح القدس نشناختی تن خریدی، نقد جاں در باختی ![1]

ایسے عالم میں حضرت علامہ کی فریاد جو انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کی تھی یاد آتی ہے ، وہ فریاد مسلمان ملت کے بارے میں تھی اور حق یہ ہے کہ اس فریاد کو پوری اولاد آدم کے لیے جاننا چاہیے ۔ علامہ عرض کرتے ہیں کہ اس دور میں مسلمان اسلام کی راہ سے ہٹ گئے ہیں ، توحید کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا ہے ، مکتبی علم نے اسے دین سے دور کر دیا ہے ، وہ دین جو ضابطۂ حیات ہے ۔

اس سے محرومی نے اسے زندگی کے مفہوم سے بے بہرہ کر دیا ہے ، مومن پہلے فقط خدا سے ڈرتا تھا اب موت سے ڈرتا ہے ۔ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ ہی میرا علم ہیں ، آپ ہی میرا سازوبرگ ہیں ۔ اس دور میں میرا واسطہ آن علوم کے متوالوں سے آن پڑا ہے جو عالم انسانیت کو روشنی کے بجائے ظلمات کی طرف لیے جا رہے ہیں ۔ میرے قلب و دماغ کو پھر وہی قدیم نور ایمان عطا ہو تا کہ میں دوسروں کو بھی راہ دکھا سکوں اور مادہ پرستوں کی پیدا کردہ تاریکیوں کو بھی دور کر سکوں ، و علی ہذا ۔

در عجم گردیدم و ہم در عرب مصطفیٰ نایاب و ارزاں بولہب
ایں مسلماں زادۂ روشن دماغ ظلمت آباد ضمیرش بے چراغ
مکتب از وے جذبۂ دیں در ربود از وجودش ایں قدر دانم کہ بود
مومن و از رمز مرگ آگاہ نیست در دلش لا غالب الا اللہ نیست !
تا دل او در میان سینہ مرد می نیندیشد مگر از خواب و خورد[2]

علامہ ذرا آگے چل کے لکھتے ہیں ۔

۱- جاوید نامہ ، ص ۵۲/۶۰۰ ۔
۲- پس چہ باید کرد ، ص ۴۹/۸۴۵ ۔

ذکر و فکر و علم و عرفانم توئی
کشتی و دریا و طوفانم توئی[1]

اور پھر بات اس التجا تک پہنچتی ہے ۔

با پرستارانِ شب دارم ستیز باز روغن درچراغِ من بریز[2]

الغرض آج کے انسانی معاشرے کا سب سے بڑا حادثہ یہ ہے کہ اسے بے پایاں دانش و علم اور مشاہدہ و تجربہ تو میسر ہے مگر حسنِ معاملت اور دلسوزی اور ہمدردی کے جوہر ناپید ہیں ۔ آج انسان اسی شے سے محروم ہے جسے انسانیت کہتے ہیں ۔ نتیجہ یہ کہ آدمی ، آدمی سے دور ہوتا جا رہا ہے ۔ علمی و عقلی بلندی اور اخلاقی پستی ایک ہی شخص میں ایک دوسری کے متوازی رواں دواں رہتی ہے ، نتیجہ یہ کہ کسی بھی صاحب علم و فضل شخص کو اس کی علمی فضیلت کی بنا پر ہم نہ قول کا سچا قرار دے سکتے ہیں ، نہ وفادار فرض کر سکتے ہیں ، نہ مخلصِ جان کہہ سکتے ہیں ، نہ ایثار پیشہ نہ مخیر ۔ جب تک تزکیۂ نفس نہ ہو اور روح آلائشوں سے پاک نہ ہو اس وقت تک حسنِ اخلاق اور حسنِ معاملات کا بار برداشت کیا ہی نہیں جا سکتا ۔ علم و فضل کا یہ تضاد اور دانش و کردار کا یہ تصادم باعثِ تخریبِ آدم ہے ، اس لیے کہ یہ صورت شخصیت کے انتشار کی دلیل ہے ۔ اس تضاد و تصادم کو دور کرنے سے شخصیت میں ''توحید'' جلوہ گر ہو گی ، پھر شخصیت کو قیام بھی میسر آ جائے گا اور استحکام بھی ۔

مقام خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق دل بند و راہِ مصطفیٰ رو ![3]

۱- پس چہ باید کرد ، ص ۸۴۶/۵۰ -
۲- ایضاً ، ص ۸۴۷/۵۱ -
۳- ارمغان حجاز ، ص ۹۴۷/۶۵ -

نشاں یہی ہے زمانے میں زندہ قوموں کا
کہ صبح و شام بدلتی ہیں ان کی تقدیریں

علامہ اقبال کا تصورِ تقدیر

حضرت علامہ نے اپنے خطبات ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' میں تصورِ تقدیر کو اس طرح موضوع نہیں بنایا کہ کامل خطبہ اس کے لیے وقف کر دیا ہو۔ تاہم دوسرے، تیسرے اور چوتھے خطبے میں اس موضوع پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ ویسے تقدیر کے باب میں ان کے نظریے کی تاثیر (Impact) تو تقریباً ہر خطبے میں جلوہ گر ہے اور وہ اس لیے کہ اگر حضرت علامہ تقدیر کے اُس تصور کے قائل نہ ہوتے جو انہوں نے خطبات میں پیش کیا ہے تو اُن کا سارا فلسفہ بے مدار ہو جاتا۔ ان کے فلسفے کی روح خودی ہے اور اگر تقدیر کا وہ مفہوم قبول کر لیا جائے جسے عام مروج معنوں میں ''قسمت'' کہا جاتا ہے تو اثباتِ خودی یا تعمیرِ خودی کا مسئلہ ہی باقی نہیں رہتا اور نفیٔ خودی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ اس ضمن میں حضرت علامہ کے اپنے کلمات یہ ہیں :

''قرآن مجید نے بارہا تقدیر کی طرف اشارہ کیا ہے لہٰذا ہمیں تقدیر کے مسئلے پر بھی غور کر لینا چاہیے، بالخصوص اس لیے کہ ''زوالِ مغرب'' میں اسپنگلر نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اسلام خودی کی نفی کا خواہش مند ہے۔''[1]

۱- تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ص ۱۶۵ -

حضرت علامہ کی نظروں میں یہ کائنات آدم کی کارگاہ ہے جس میں آسے اپنے جملہ امکانات اور قویٰ کو بروئے کار لانا ہے۔ انہوں نے اپنی نظم ''روحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے'' میں بالفاظِ ذیل اس عندیے کا اظہار کیا ہے۔

ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل، یہ گھٹائیں
یہ گنبدِ افلاک، یہ خاموش فضائیں
یہ کوہ، یہ صحرا، یہ سمندر، یہ ہوائیں
تھیں پیشِ نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
آئینۂ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ!

خورشیدِ جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں
آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں
جنت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں
اے پیکرِ گل کوششِ پیہم کی جزا دیکھ![1]

ساتھ ہی یہ بھی پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ آدم کی یہ کارگاہ، یہ دنیا، یہ کائنات خود اپنی جگہ تا حال مکمل نہیں، یہ نہ مسدود ہے نہ مقفل،

ع کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کن فیکوں![2]

ان کے نزدیک یہ جہاں، جہانِ نامی ہے چنانچہ ہر لحظہ بڑھتے رہنے والے جہان کی اس کیفیت پر قرآن کے حوالے سے استدلال کرتے ہیں ''کل یوم ھو فی شان''[3] (ہر روز خدا کسی نئے رنگ، حال، روپ اور دھندے میں ہوتا ہے۔) ''یزید فی الخلق

۱۔ بالِ جبریل، ص ۱۳۳/۴۲۵، ص ۱۳۲/۳۲۴۔
۲۔ ایضاً، ص ۲۸/۳۲۰۔
۳۔ قرآنِ کریم۔ سورہ ۵۵، آیت ۲۹۔

مایشاء"[1] (خلق میں حسبِ منشا و رضا اضافہ کرتا رہتا ہے ۔)

حضرت علامہ دوسرے خطبے میں فرماتے ہیں — اور اس اقتباس کے مطالعے سے ان کی فکر کی نہج کا پتہ بخوبی چل جاتا ہے ۔

"ہم اسے (کائنات کو) موجود کہتے ہیں تو ان معنوں میں کہ وہ ایک غیر معین امکان ہے چنانچہ بطور ایک "نامی کل" زمانے کا یہی تصور ہے جس کو قرآن پاک نے تقدیر سے تعبیر کیا ہے لیکن جس کو نہ اسلامی دنیا ٹھیک ٹھیک سمجھ سکی نہ غیر اسلامی دنیا ۔ دراصل تقدیر عبارت ہے اس زمانے سے جس کا انکشاف ابھی باقی ہے ۔"[2]
بزبان شعر انھوں نے یہی بات اس طرح بیان کی :

سلسلۂ روز و شب ، تارِ حریرِ دو رنگ
جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات[3]

یہ کائنات ! ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دما دم صدائے کن فیکوں ![4]

جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود !
کہ خالی نہیں ہے ضمیرِ وجود ![5]

یہ کائنات جسے حضرت علامہ "نامیٔ کل" کہتے ہیں ، ایک غیر معین امکان اس لیے ہے کہ بڑھنے اور تکمیل کی راہیں طے کرنے کی آزادی ہے ۔ اسے یکبارگی کامل و سالم و جامع بنا کر نہیں بھیج دیا گیا ۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر زمانہ تخلیق کے جوہر سے محروم ہوتا ،

۱- قرآن کریم - سورہ ۳۵ ، آیت ۱ -
۲- تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ ، ص ۷۶ -
۳- بال جبریل ، ص ۹۳/۳۸۵ -
۴- ایضاً ، ص ۲۸/۳۲۰ -
۵- ایضاً ، ص ۱۲۸/۴۲۰ -

اور اس کا دوران محض گردشِ پرکار ہوتا ، جس کا مطلب ہے تکرارِ محض - یہی باعث ہے کہ وہ نطشے کے نظریہ Eternal Recurrence کو محض Eternal Repitition قرار دیتے ہیں — بالفاظ دیگر ''کڑی میکانیت''[1] - اس مضمون کو ان کے اپنے بیان میں اس طرح پیش کیا جا سکتا ہے :

''قرآن پاک کا ارشاد ہے ''کل یوم ھو فی شان'' - لٰہذا زمان حقیقی کی زندگی زمانِ متسلسل کی زنجیروں سے آزادی اور ابداع کا عمل ہے اور اس لیے تخلیق کا فعل بھی آزادی کا فعل ہے کیونکہ تخلیق تکرار کی ضد ہے اور تکرار خاصہ ہے میکانیاتی طریقِ کار کا''[2] - نظم ''زمانہ'' کا ایک شعر ہے -

مری صراحی سے قطرہ قطرہ نئے حوادث ٹپک رہے ہیں
میں اپنی تسبیحِ روز و شب کا شمار کرتا ہوں دانہ دانہ ![3]

اب اگلا مرحلہ آتا ہے ، تکرار سے تو انکار ہو چکا لیکن کیا مخلوقات یا ممکنات کو کسی بندھے بندھائے انداز میں اور ضابطے کی کڑی زنجیروں میں کس کے خارج کے ہر لحظہ سے حکم دیا جاتا ہے یا ادب سکھایا جاتا ہے یا خود ہر شے کے اندر وہ جوہر ودیعت کر دیا گیا ہے جو زمانے کے ساتھ ساتھ اپنے تکمیلی مراحل خود اپنے اندر سے اور اپنی ذات میں طے کر رہا ہے - حضرت علامہ خود زمانے کو امکان غیر معین جانتے ہیں اور کارخانۂ قدرت کو قوائے ذاتی سے مالا مال جانتے ہیں جو اندرونی زورِ نمو سے بروئے کار آتی رہتی ہیں - حضرتِ علامہ کے الفاظ میں -

''ہم زمانے کی حرکت کا تصور ایک پہلے سے کھینچے ہوئے خط کی شکل میں نہیں کریں گے کیونکہ یہ خط ابھی کھنچ رہا ہے

۱- تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ ، ص ۱۷۴ -
۲- ایضاً ، ص ۸۲ -
۳- بال جبریل ، ص ۱۲۹/۴۲۱ -

اور اس سے مطلب ہے وہ امکانات جو ہو سکتا ہے وقوع میں آئیں اور ہو سکتا ہے نہ آئیں''[1] ۔

یہ وقوع میں آئیں یا نہ آئیں ''Open Possibilities'' کا ترجمہ ہے (آپ چاہیں تو اس کا ترجمہ ''غیر معین امکانات'' کر لیں) ۔ اسی نکتے کی وضاحت کے طور پر سطورِ ذیل بھی ملاحظہ ہو جائیں ۔

''وہ ہستی جس سے اس کو جزو و کل کا سا تعلق ہے اس میں اضافہ ممکن ہے ، ہم اس کو غیر محدود کہتے ہیں تو ان معنوں میں کہ اس کی وسعت پر کوئی حد قائم نہیں کی جا سکتی ، یعنی وہ غیر محدود ہے تو بالقوۃ ، بالفعل نہیں اور اس لیے فطرت کا تصور بھی ایک زندہ اور ہر لحظہ بڑھتی اور پھیلتی ہوئی وحدت نامیہ کی حیثیت سے کرنا چاہیے جس کے نشو و نما پر ہم خارج سے کوئی حد قائم نہیں کر سکتے ۔ اس کی کوئی حد ہے تو داخلی ، یعنی وہ ذاتِ مشہود جو اس میں جاری و ساری ہے اور جس نے اس کو سہارا دے رکھا ہے ۔ قرآن پاک کا ارشاد ہے : و ان الی ربک المنتھٰی ۔''[2]

یہ ہے اس جہاں کی کیفیت و فطرت جس میں آدم کو بسایا گیا ہے ۔ یہ جہاں آدم کا تربیت کدہ بھی ہے اور تجربہ گاہ بھی ۔ اُسے اپنی جملہ صلاحیتوں کی مدد سے یہاں اپنا مقام آپ پیدا کرنا ہے ۔ ہر فردِ آدم ایک ذمہ دار ہستی ہے ، ہر ایک کو اپنے عمل کا بار خود اُٹھانا ہے '' أن لاتزر وازرۃ وزرأخریٰ''[3] اور قیامت کے روز خدا کے حضور بھی ہر ایک کو فرداً فرداً جانا ہے — و کلھم اتیہ یوم القیامۃ فرداً[4] ۔

۱- تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ ، ص ۸۴ -
۲- ایضاً ، ص ۸۷ -
۳- قرآن کریم ، سورہ ۵۳ ، آیت ۳۸ -
۴- ایضاً ، سورہ ۱۹ ، آیت ۹۵ -

واضح ہے کہ اگر اسے قیامت کے روز اپنے ذاتی نامۂ اعمال کے لیے جواب دہ ہونا ہے تو یہ جواب دہی اس وقت تک کوئی معنٰی نہیں رکھتی جب تک یہ بات مان نہ لی جائے کہ آدمی پر اس کے اعمال کی ذمہ داری عاید ہوتی ہے - جس کا مطلب ہے کہ وہ پسند و ناپسند کا مالک ہے ، وہ صاحبِ نظر و ارادہ ہے ، اور وہ انتخاب و اختیار (Choice) کی صلاحیت سے بہرہ مند ہے ، اگر وہ بیدار ہے اور تعمیرِ ذات کے لیے سرگرم ہے تو اُس کی حیثیت کچھ اور ہے ، اور اگر وہ غافل ہے اور کم ہمتی و ضعفِ ارادہ کا مظاہرہ کرتا ہے تو محروم رہتا ہے - بزبانِ ''زمانہ'' یوں کہہ لیجیے -

ہر ایک سے آشنا ہوں ، لیکن جُدا جُدا رسم و راہ میری
کسی کا را کب ، کسی کا مرکب ، کسی کو عبرت کا تازیانہ !

نہ تھا اگر تو شریکِ محفل ، قصور تیرا ہے یا کہ میرا
مرا طریقہ نہیں کہ رکھ لوں کسی کی خاطر مئے شبانہ ![1]

حضرتِ علامہ کی ''تشکیل جدید'' کے پہلے خطبے کی پہلی سطور ہی یہ ہیں ۔

''یہ عالم جس میں ہم رہتے ہیں اس کی نوعیت کیا ہے اور ترکیب کیا ہے ؟ کیا اس کی ساخت میں دوامی عنصر موجود ہے ؟ ہمیں اس سے کیا تعلق ہے اور ہمارا اس میں کیا مقام ہے ؟ باعتبار اس مقام کے ہمارا طرزِ عمل کیا ہونا چاہیے ؟''[2]

اس آخری جملے سے بخوبی عیاں ہو جاتا ہے کہ وہ آدم کو معنوی اعتبار سے کوئی بنا بنایا اور بندھا بندھایا وجود نہیں جانتے کہ جس طرح بنایا گیا بن گیا ، جس طرح باندھ دیا گیا بندھ گیا - یوں

۱- بال جبریل ، ص ۲۱/۱۲۹ ، ۲۲/۱۳۰ -
۲- اصل انگریزی عبارت یہ ہے -

"...... And what is the kind of conduct that befits the place we occupy."

کہ اس میں ارتقاء و کمال کی کوئی اہلیت ، ہمت اور عزیمت موجود نہیں - ''ہمارا طرزِ عمل کیا ہونا چاہیے؟'' تقاضا کرتا ہے کہ اپنے طرزِ عمل کی تعیین خود آدم ہی کو کرنا ہے ، اختیار (Choice) اس کا اپنا ہے -

حضرت علامہ نے ''تقدیر'' کی اس تعبیر سے سخت اختلاف کیا ہے جسے عرفِ عام میں قسمت کہا جاتا ہے - انہوں نے اس اختلاف کا اظہار تلخ لہجے میں کیا ہے - تقدیر کی اس عام اور مروج تعبیر کا مفہوم تو یہ ہوا کہ آدمی دنیا کے میدان عمل میں وارد ہو کر بھی آزادیٔ عمل کا حق نہیں رکھتا ، اسے جیسا بنا کر ارسال کر دیا گیا ہے ویسا ہی رہتا ہے جس کے نتیجہ میں بڑے اعتماد کے ساتھ فرض کیا جا سکتا ہے کہ جو مقدر ہے وہ تو ہو کر رہے گا ، سعی و سرگرمی بے سود ہے - نہ حال سنوارا جا سکتا ہے نہ مستقبل - اسی طرح نہ حال بگاڑا جا سکتا ہے نہ مستقبل - یہ وہ کیفیت ہے جسے ''ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظرِ فردا'' ہونا قرار دیا جائے گا اور اسی کیفیت کا پیدا کردہ وہ رویہ تھا کہ مسلم ملت ''تن بہ تقدیر'' ہو کر بیٹھ رہی اور مغرب کی مادہ پرست قوموں نے آٹھ کر آن کا چارج سنبھال لیا -

فرنگی صید بست از کعبہ و دیر
صدا از خانقاہاں رفت 'لا غیر'
حکایت پیش مُلّا باز گفتم !
دعا فرمود 'یا رب عاقبت خیر' !¹

یہ خیال یا عقیدہ ''نفیٔ خودی'' کا متضمن ہے - اس خیال کے حامی افراد ولولے اور عزم کی دولت سے محروم رہتے ہیں - ان کی حیثیت جمادات و نباتات کی سی ہو کر رہ جاتی ہے اور ظاہر ہے کہ

۱- ارمغانِ حجاز ، ص ۹۵۵/۲۳ -

نباتی و جماداتی حیثیت اس حیثیت سے نہایت پست ہے جو آدمی کو نیابتِ الٰہی کے منصب پر فائز ہونے کے باعث حاصل ہے - ہر فرد اپنی تقدیر چنتا ہے اور ''ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ'' — افراد کی انفرادی تقدیر کیا ہے ؟ انہوں نے اپنے لیے کیا انتخاب کیا ؟ اس انتخاب میں ولولہ و عزم اور بلندی و ترقی کا معیار کیا ہے اور مقاصد کیا ہیں ؟ اُن مقاصد میں از راہِ مقصود ''توحید'' کس قدر ہے ؟

اگر افراد معاشرہ اپنی جگہ پست ہمت اور کج بیں ہیں تو پورا معاشرہ پست ہمت اور کج بیں ہوگا - چنانچہ انفرادی نکبت اور اجتماعی نکبت میں کوئی فرق نہ ہوگا - یہ نہیں ہو سکتا کہ افراد کا رویہ کچھ اور ہو اور پورے معاشرے کا انداز کچھ اور ہو - تقریباً ایک ہی رویہ ہر شعبے میں کام کرتا ہے اور اسی حاوی رویے کے مطابق اس معاشرے کے ساتھ سلوک کیا جاتا ہے - یہ تو ہو سکتا ہے کہ اگر اکثریت معیاری افراد کی ہو تو اس میں ایک تعداد غیر معیاری افراد کی بھی کھپ جائے ، مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ کسی قوم کے افراد کا حاوی عنصر زوال پذیر اور غیر معیاری ہو اور وہ قلیل تعداد کے قابل اور اہل افراد کے باعث فطرت کی جانب سے عائد کردہ اصولی سزا اور عقوبت سے بچ جائے -

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف ![1]

اسی نظریے کو انہوں نے ''اسلامی ثقافت کی روح'' والے خطبے میں قرآن کے احکام کی روشنی میں یوں بیان کیا ہے - ''قرآن پاک نے تاریخ کو ایام اللہ سے تعبیر کیا ہے اور اسے علم کا ایک سرچشمہ ٹھہرایا ہے - اس کی ایک اور بنیادی تعلیم یہ ہے کہ انہیں اپنی

۱- ضرب کلیم ، ص ۵۴۸/۸۶ -

بد اعمالی کی سزا اس دنیا میں بھی مل جاتی ہے ۔"[1]

غرض جس معاشرے کے افراد کا یہ عالم ہو ، وہ پورا معاشرہ کاہل ہوگا جس میں نہ تحفظ کی امنگ ہوگی نہ ترقی کی ترنگ ، اس لیے کہ امنگ عطا ہے مقاصد کی اور ترنگ بخشش ہے آسید ، کامرانی اور لذتِ کامگاری کی ۔ اعلٰی مقاصد کی خاطر اٹھائی جانے والی مشقت جملہ قوائے حواس کو بیدار رکھتی ہے ۔ اس لیے مشقت پورے وجودِ انسانی کی اجتماعی کاوش کا نام ہے اور یہ پوری شخصیت کا انتخاب (Choice) ہے ۔ بے مقصد اور بے مقصود قوم کی ذہانت منجمد ہو جاتی ہے ، حافظہ متحجر ہو جاتا ہے ، حواس سو جاتے ہیں — بے حال قوم جس کا ماضی خواب ہو اور مستقبل خیال ۔

حضرت علامہ نے ملتِ اسلامیہ سے تعلق رکھنے والی اقوام کو اسی "نیم مردہ" حالت میں دیکھا اور چونکہ وہ برعظیم پاک و ہند کے مسلمانوں کو بہت ہی قریب سے دیکھ رہے تھے اس لیے کہ وہ ان میں موجود تھے لہٰذا آن کی "تن بہ تقدیر" صورتِ حال انہیں براہِ راست اذیت دیتی تھی ۔

بگو ہندی مسلماں را کہ خوش باش
بہشتے فی سبیل اللہ ہم ہست ![2]

طنزاً فرمایا کہ ہندی مسلمان کو خوشخبری دے دو کہ ایک بہشت وہ بھی ہے جو خیرات کے طور پر دے جائے گی ۔ مطلب یہ کہ اگر ہاتھ ہلائے بغیر روشن اور مسرت بخش مستقبل کی آمیدیں

۱۔ آخری جملے کے اصل الفاظ یہ ہیں اور وہ اوپر درج کردہ شعر کے مفہوم سے زیادہ قریب ہیں ۔ ترجمہ قدرے ہٹا ہوا معلوم ہوتا ہے ۔

"It is one of the most essential teachings of the Quran that nations are collectively judged, and suffer for their misdeeds here and now."

۲۔ ارمغانِ حجاز ، ص ۱۰۲۸/۱۴۶ ۔

دل میں پال رہے ہو تو جان لو کہ یہاں ''لیس للانسان الاماسعیٰ''[1] کا اصول کار فرما ہے - یہاں خوشیاں کمائی جاتی ہیں - یہ اس قرآن کا فیصلہ ہے جسے حضرت علامہ ''کتابِ زندہ'' کہتے ہیں -

اے چو شبنم بر زمیں آفتندۂ در بغل داری کتابِ زندۂ[2]

اس کتابِ زندہ کے ہوتے مسلمان کیوں مر گئے ؟ اس کی توجیہہ خود حضرت علامہ کسی حد تک ان الفاظ میں کرتے ہیں -

''لیکن اس تقدیر پرستی کی ایک تاریخ ہے جس کی تشریح کے لیے دفتر چاہییے - یہاں یہ عرض کر دینا کافی ہو گا کہ یہ تقدیر پرستی جس کو مغربی مصنفین لفظ ''قسمت'' سے ادا کرتے ہیں کچھ تو نتیجہ تھی بعض فلسفیانہ افکار اور کچھ سیاسی مصلحت پسندیوں کا - پھر اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ زندگی کی وہ قوت جو اسلام نے مسلمانوں کے اندر پیدا کی تھی رفتہ رفتہ کم ہوتی گئی اور آگے چل کر جب فلسفے نے اس امر کی تحقیق میں کہ لفظ علت کا اطلاق اگر ذاتِ ایزدی پر کیا گیا تو اس کے معنی کیا ہوں گے ؟ علیٰ ہذا — یہ فرض کرتے ہوئے کہ علت و معلول کو جو آپس میں نسبت ہے زمانہ اس کی شرط ضروری ہے ، ایک ایسے خدا کا تصور قائم کیا جو موجوداتِ عالم سے وراء الوراء قدیم ہی سے موجود ہے اور اس لیے خارج سے اس پر عمل کر رہا ہے - لہٰذا کہا گیا کہ علت و معلول کا سلسلہ چونکہ بالآخر ذاتِ خداوندی پر ختم ہو جاتا ہے ، اندریں صورت جو کچھ بھی ہو رہا ہے خدا ہی کے حکم سے ہو رہا ہے -''[3]

۱- قرآن کریم - سورۃ ۵۳ ، آیت ۳۹ -
۲- اسرار و رموز ، ص ۱۶۵/۱۶۵ -
۳- تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ ، ص ۱۶۷ -

"جو کچھ بھی ہو رہا ہے خدا ہی کے حکم سے ہور ہا ہے" میں کوئی خرابی نہ تھی ۔ فرق صرف یہ ہے کہ ایک طرف عیاش اور ظالم ، اور دوسری طرف کاہل اور آرام طلب لوگوں نے اپنی عملی افراط و تفریط پر پردہ ڈالنے کے لیے یہ عذر قائم کر لیا کہ ہم اپنی طرف سے تو کچھ نہیں کرتے اور نہ ہی کرنے پر قادر ہیں ۔ ورنہ اگر یہ مان لیا جائے کہ خدا نے اپنے حکمِ مطلق اور قدرت کاملہ کی بدولت انسان کو تمیز و شعور کا جوہر دیا اور خیروشر کو سمجھنے کی اہلیت سے نوازا ہے (ان احسنتم احسنتم لانفسکم و ان اساتم فلھا)[1] اسے عزم و ارادہ بھی عطا کیا ہے اور تحمل و برداشت کا ملکہ بھی ارزانی کیا ہے تو اس سے اللہ کی شانِ خلاقی اور حاکمیت مطلقہ سے انکار کیونکر واجب آتا ہے ؟ اللہ تعالیٰ کی مرضی یہی ہے کہ نباتات و جمادات اور بہائم اس کارخانہ قدرت میں جاری و ساری بنیادی اور دائمی اصولوں کے مطابق اور مقررہ معیاروں کے موافق پیدا ہوں ، زندگی بسر کریں اور چل بسیں ۔ مطلب یہ کہ ان کے امکانات و مقدرات محدود ہیں مگر انسان کے بارے میں اس کا فیصلہ یہ ہے کہ یہ جملہ موجودات کو مسخر کرے گا ۔ گویا انسان کی شکل میں قادرِ مطلق نے ایک ایسا وجود تخلیق کیا جس میں خود اس کی ربانی صفات کا عملی اور زندہ پرتو موجود ہو ۔ اسی وجود کو یہ شرف حاصل ہے کہ اسے اللہ کی روح سے حصہ میسر آیا (ونفخت فیہ من روحی) — اگر وہ اس روح کے ایک حصے کا مالک نہ ہوتا تو اس سے ہرگز یہ نہ کہا جاتا کہ وہ اللہ کے اخلاق اپنائے (تخلقوا باخلاق اللہ) اور یہ جبھی ممکن ہے کہ وہ مادی کائنات کے بندھنوں کو اپنی راہ میں حائل نہ ہونے دے ۔ اگر وہ بھی محض جبلتوں کے تقاضے پورے کرتا رہے جس طرح حیوان کرتے ہیں تو پھر اس میں اور عام حیوان میں کوئی

۱۔ قرآن کریم ۔ سورۃ ۱۷ ، آیت ۷ ۔

فرق نہیں ۔ ابن مسکویہ لکھتے ہیں :

"و الا نسان اذا نقصت افعالہ و قصرت عما خلق لہ اعنی ان تکون افعالہ التی تصدر عنہ و عن رویتہ غیر کاملة احری بان یحط عن مرتبة الانسانیة الی المرتبة البہیمیة ھذا ان صدرت افعالہ الانسانیة عنہ ناقصة غیر تامة"[۱]۔

یعنی "جب انسان کے اعمال اس درجے سے فروتر اور کم تر واقع ہوں جس درجے کے اعمال کی خاطر اسے پیدا کیا گیا ہے، مطلب ہے کہ اگر اس سے اس کی افتادِ طبع کے باعث جو کچھ سرزد ہوتا ہے وہ کامل اور معیاری نہیں تو پھر وہ مستحق ہو جاتا ہے کہ اسے حیوان کے مرتبے پر گرا دیا جائے اور یہ فقط اس حال میں ہو گا جب اس کے انسانی افعال میں نقص اور کمی واقع ہو اور وہ ویسے نہ ہوں جیسے کہ ہونے چاہئیں ۔"

ظاہر ہے کہ انسان کو یہ جوہر اختیار اور ملکۂ انتخاب خود خدا نے دیا ہے اور یہ عین خدا کی منشا کے مطابق ہے ۔ یہی باعث ہے کہ جب انسان اس مقام کا عملاً اہل نہیں رہتا اور تمیزِ خیروشر کر کے اپنے مقامِ آدمیت کا تحفظ نہیں کرتا تو آئینِ فطرت اسے سزا دیتا ہے اور وہ حیوان بن کر رہ جاتا ہے خواہ اس کی ظاہری شکل و صورت کتنی ہی مہذب و مثقف ہو اور اس کے نمائشی آداب کتنے ہی نفیس ہوں مگر اس کے اندر جو روح کارفرما ہوتی ہے وہ حیوانی ہوس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی ۔ جب یہ حیوانی ہوس عام ہو جاتی ہے تو قدرت سزا کے طور پر انہیں لوہے کے پنجروں میں بند کر دیتی ہے جہاں ان کے حصے کا آذوقہ انہیں مل جاتا ہے اور وہ دوسروں کا خون پینے سے جبراً روک دیے جاتے ہیں ۔

۱۔ تہذیب الاخلاق ، دار مکتبة الحیاة ، بیروت ۔ ص ۱۶ ۔

مگر بہرحال وہ مادہ پرست وجود رہتے حیوان ہی ہیں ، ان کے پنجروں کا رقبہ وسیع ہو تو اُسے کمیونسٹ معاشرہ کہتے ہیں ، اس طرح دیکھیں تو کمیونزم سزا ہے ، کمیونزم دوا نہیں ۔

پھر جب آدمی حیوان بن جائے تو وہ اُس شے کے شعور سے بھی محروم ہو جاتا ہے جسے آدمیت کہتے ہیں ۔ آدم کے ہاتھوں ''مقامِ آدمیت'' کا تحفظ حضرت علامہ کے نزدیک اثباتِ خودی ہے ، اس کے برعکس نفیٔ خودی ۔ اگر آدمی کو ایسا بنایا جاتا کہ وہ فقط خیر ہی کا انتخاب کر سکتا اور شر اختیار کرنے کا اہل نہ ہوتا تو پھر یہ کہنا بجا ہوتا کہ وہ مجبور ہے ۔ اب چونکہ وہ اختیارِ شر اور انتخابِ خیر پر قادر ہے اور دونوں کے مابین تمیز کر سکتا ہے ، لہٰذا ثابت ہوا کہ وہ مجبورِ محض نہیں ، کچھ اس کا اپنا میدانِ عمل بھی ہے جہاں وہ آزاد ہے ۔ بقول حضرت علامہ مشیتِ ایزدیؔ نے اس کی آزادیٔ عمل میں خلل نہ ڈالنے کی خاطر یہ خطرہ قبول کر لیا کہ آدمی شر بھی انتخاب کر لے ۔ ''لہٰذا اگر مشیتِ ایزدی یونہی تھی کہ اس طرح کا خطرہ برداشت کر لیا جائے تو اس سے یہ حقیقت بھی آشکارا ہو جاتی ہے کہ خدا کو اپنے بندوں پر کس قدر اعتماد ہے ۔ اندریں صورت انسان کا بھی فرض ہے کہ اس اعتماد میں پورا اُترے ۔ یوں بھی جس ہستی کی تخلیق ''احسنِ تقویم'' پر ہوئی مگر جسے ''اسفل السافلین'' میں لوٹا دیا گیا ، اس کی مخفی قوتوں کی تربیت کچھ یونہی ممکن تھی کہ اس طرح کا خطرہ برداشت کر لیا جائے ۔''[1]

تسخیرِ ارض و سما و مافیہا اور نفخ روح والی آیات گویا استحکام و اثبات اور اقدام و ارتقاء کے احکام ہیں اور یہیں سے صاحبِ ایمان آدم دیگر مخلوقاتِ عالم سے جدا ہو جاتا ہے اس لیے کہ دیگر مخلوقات احکامِ خیروشر کی روشنی میں عمل پیرا نہیں ہوتیں ۔ انہیں Choice نہیں دیا گیا ۔

۱- تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ ، ص ۱۲۹ ۔

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات   مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند[1]

اس شعر سے یہ بھی عیاں ہے کہ جب آدم ایمان سے محروم ہو جاتا ہے تو وہ انسانیت کے مقام سے بھی ساتھ ہی محروم ہو جاتا ہے اور حیوانی سطح کی جانب لڑھک جاتا ہے بلکہ نباتات و جمادات کے مقام پر پہنچ جاتا ہے۔

حیوان اپنی نوع سے بلند تر نہیں ہو سکتے مگر انسان کو بہترین تخلیق میسر ہے، لہٰذا وہ اخلاقی، روحانی اور وجدانی بے شمار بلندیوں تک پہنچ سکتا ہے۔ وہاں تک بھی جا سکتا ہے، جہاں فرشتوں کے پر جلیں۔ لیکن جب انسان انسانیت کا تحفظ نہیں کر سکتا تو یہ پستی کی اس حد تک جا پہنچتا ہے جہاں تک کوئی حیوان نہیں پہنچتا۔ اس لیے کہ حیوان کے ممکنات محدود ہیں اور انسان کے ممکنات غیر محدود۔ اگر انسان اپنی قوی تر اور کار آمد تر عقلی، فکری اور ذہنی صلاحیتوں کو بدی کا ہتھیار بنا لے تو ظاہر ہے کہ کوئی بھی حیوان اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ کیا حیوان اپنی نوع کی اجتماعی ہلاکت کے لیے گیس چیمبرز ایجاد کر سکتا ہے؟ یا ہائیڈروجن بم بنا سکتا ہے؟

مصطفٰی الکیک نے الاستاذ عبدالکریم الخطیب کی کتاب قضیۃ الالوھیۃ کے حوالے سے یہی بات ان الفاظ میں بیان کی ہے۔

"اما حین ینکر الانسان جانبہ الروحی ویعیش علی انہ مادۃ من لحم و دم فانہ لن یرتفع کثیراً عن حیاۃ الوحوش الضاریۃ و النسور الکاسرۃ۔ حیاۃ کلھا عراک و صراع و ان استخدم الصواریخ الذریۃ و القذائف الھیدر و جینیۃ بدل الناب و المخلب"[2]۔

۱- ضرب کلیم، ص ۶۴/۵۲۶ -

۲- بین عالمین، دارالمعارف، مصر۔ ص ۱۲۴ -

''جب انسان اپنے روحانی پہلو سے قطع نظر کر کے یوں زندگی بسر کرنے لگے گویا وہ محض گوشت اور خون کا سواد ہے تو پھر وہ درندہ حیوانوں اور گدھوں کی زندگی سے ہرگز بلند نہیں ہو سکتا، اس کی زندگی سراسر بیکار اور مار دھاڑ کی زندگی ہوتی ہے۔ فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ لمبے تیز دانتوں اور پنجوں کے بجائے ذری راکٹ اور ہائیڈروجنی میزائل کام میں لاتا ہے۔''

ایسی وسیع الممکنات مخلوق کو خیروشر سے آگاہ کرنا اور پھر پابندِ آداب کرنا لازم تھا تاکہ وہ اپنی صلاحیتوں کو متوازن رکھے۔ چنانچہ وحی کی ضرورت لاحق ہوئی تا آنکہ مجموعی طور پر اولادِ آدم ایک ایسے مرحلے میں داخل ہو گئی جہاں اس کے قوائے شعور اور ملکہ ہائے فہم و فراست سنِ بلوغ کو پہنچ گئے۔ اس لیے آسے کامل ترین وحی اور کامل ترین آسوہ (اسوۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) دے کر تنبیہہ کر دی گئی کہ اختیار خود تمہارا ہے۔ مگر ایک راہ تو یہ ہے جو صراطِ مستقیم کہلاتی ہے اور یہ توحید و رسالت کی راہ ہے۔ اس کے علاوہ کئی راہیں ہیں، وہ پرپیچ بھی ہیں اور پہنچاتی بھی خرابی و بربادی کی منزل پر ہیں۔ فیصلہ بہرحال تمہارا اپنا ہے۔

سوچ سمجھ کر کوئی فیصلہ کرنا آسان کام نہیں، سوچا سمجھا فیصلہ فقط وہی افراد کر سکتے ہیں جن کی ذات میں ''توحید'' موجود ہے۔ منتشر شخصیت کے مالک افراد ''کہیں ایسا نہ ہو جائے کہیں ایسا نہ ہو جائے'' کی اذیت ناک کیفیت میں مبتلا رہتے ہیں، فیصلہ ایک طرح کا اثبات خودی ہے اور حضرت علامہ کے الفاظ میں ''۔۔۔۔ خودی کا اظہار اس وحدت میں ہوتا ہے جسے ہم کیفیاتِ نفسی کی وحدت کہتے ہیں۔۔۔۔''[1] کیفیات نفسی کی یا یوں کہیے کہ شخصیت کی یہ توحید بے تربیتِ ذات میسر نہیں آتی، یہ جوہر یا

۱۔ تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ، ص ۱۴۸ ۔

وصف باہر سے خیرات یا عطیے کے طور پر مل جانے والی شے نہیں ۔ بقول کسے Unity is achieved not given (توحیدِ ذات کوشش کر کے حاصل کرنا پڑتی ہے بنی بنائی نہیں مل جاتی) سقراط نے کہا تھا "Know thyself" (عرفانِ ذات حاصل کرو) ، یہ بھی کہا "Choose thyself" (انتخابِ ذات کرو) ، جس کا مطلب ہے کہ تم کس حیثیت میں زندگی بسر کرنا چاہتے ہو، کیا بننا چاہتے ہو ، کون سی منزل مقرر کی ہے ۔ حضرت علامہ اسی فیصلے کو انتخابِ تقدیر کہتے ہیں ۔ کون سی تقدیر اختیار کرنا چاہتے ہو کا استفسار اس لیے جائز ہے کہ آدم میں تکوینِ ذات کا امکان موجود ہے ۔ جہاں وہ یہ جان سکتا ہے کہ وہ کیا ہے ، وہاں وہ یہ فیصلہ بھی کر سکتا ہے کہ اسے کیا ہونا چاہیے ۔ چنانچہ اس کی تکوین لحظہ بہ لحظہ عمل میں آتی رہتی ہے ، کچھ حالتیں مرتی جاتی ہیں ، کچھ حالتیں پیدا ہوتی چلی جاتی ہیں ۔ کچھ شخصیت پیچھے رہ جاتی ہے کچھ آگے بڑھ جاتی ہے ۔ خود حضرت علامہ کے الفاظ میں "ہماری تکوین کی صورت ہی یہ ہے کہ ہم وہ کچھ نہ رہیں جو ہیں ۔ زندگی کا راستہ گویا موت در موت سے گزرتا ہے ۔"[1]

شخصیت کی ارادی تعمیر یا اختیارِ تقدیر کا مضمون حضرت علامہ کے کلام میں بارہا جلوے دکھاتا ہے اور اسرارِ خودی کی منزل سے لے کر جو بانگِ درا کے تیسرے حصے کے متوازی ہے ۔ کلام کے بالکل آخری حصے تک اس عندیے میں ضعف نہ آیا ، اُلٹا اس کے اثبات میں اضافہ ہوتا چلا گیا ۔ تقدیر کے انتخاب کا یہ مضمون اسرارِ خودی کے ابتدائی صفحات ہی میں جلوہ دکھانے لگ گیا تھا ۔ مثلاً

---

١ - تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ ، ص ٨٣ -
اور اصل انگریزی کے الفاظ یہ ہیں ۔

"We become by ceasing to be what we are. Life is a passage through a series of deaths."

قطرۂ شبنم سرِ شاخِ گلے تافت مثلِ اشکِ چشمِ بلبلے
مرغِ مضطر زیرِ شاخِ گل رسید دردہانش قطرۂ شبنم چکید
چوں ز سوزِ تشنگی طائر گداخت از حیاتِ دیگرے سرمایہ ساخت
غافل از حفظِ خودی یکدم مشو ریزۂ الماس شو ، شبنم مشو[۱]

"ایک، قطرۂ شبنم پھول کی ایک ٹہنی کی نوک پر بلبل کی آنکھ کے آنسو کی طرح چمک رہا تھا - پیاس کے ہاتھوں بے بس ایک پرندہ اس ٹہنی کے نیچے پہنچا اور وہ قطرۂ شبنم اس کے منہہ میں ٹپک پڑا - ظاہر ہے کہ جب اس پرندے کو پیاس کی تپش نے جلایا تو اس نے دوسرے کے وجود کو اپنے لیے سرمایۂ حیات بنا لیا - لہٰذا تجھے خودی کے پاس سے ایک لمحے کے لیے بھی غافل نہ ہونا چاہیے۔ تجھے قطرۂ شبنم ہرگز نہیں بننا چاہیے - تجھے ریزۂ الماس کی طرح رہنا چاہیے۔" مطلب یہ کہ حفظِ خودی سے غفلت ضعف کا باعث ہوتی ہے اور پھر ضعف کسی صاحبِ قوت کی حرص و آز کے منہہ میں دھکیل دیتا ہے - اسی مضمون کو بالِ جبریل کی نظم ابوالعلامعری میں واضح کیا گیا ہے -

کہتے ہیں کبھی گوشت نہ کھاتا تھا معری
پھل پھول پہ کرتا تھا ہمیشہ گزر اوقات
اک دوست نے بھونا ہوا تیتر اسے بھیجا
شاید کہ وہ شاطر اسی تدبیر سے ہومات
یہ خوانِ تر و تازہ معری نے جو دیکھا
کہنے لگا وہ صاحبِ غفران و لزومات
اے مرغک بیچارہ ، ذرا مجھ کو بتا تو
تیرا وہ گنہ کیا تھا یہ ہے جس کی مکافات ؟

۱- اسرار و رموز ، ص ۵۵/۵۴،۵۵/۵۴ -

افسوس صد افسوس کہ شاہیں نہ بنا تو
دیکھے نہ تری آنکھ نے فطرت کے اشارات!
تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات![1]

اب یہ تو ظاہر ہے کہ تیتر کو تیتر ہی رہنا ہے، وہ شاہیں نہیں ہو سکتا۔ یہ رمز آدمی کے سمجھنے کی بات ہے۔ پرندے کے پاس تو اختیار و انتخاب کا ملکہ موجود نہیں۔ آدمی کے پاس یہ ملکہ موجود ہے لہٰذا یہ تیتر اور شاہیں کے درجات کا فرق تازیانۂ عبرت ہے تاکہ آدمی فیصلہ کر سکے کہ اسے ضعیف بن کر رہنا ہے یا قوی ہو کر۔ ''جاوید نامہ'' میں بھی تلقین موجود ہے اور انتخابِ تقدیر کے باب میں مزے کی باتیں کہی گئی ہیں۔

گر زیک تقدیر خوں گردد جگر — خواہ از حق حکمِ تقدیرِ دگر
تو اگر تقدیرِ نو خواہی رواست — زانکہ تقدیراتِ حق لا انتہاست
رمزبا ریکش بحرفے مضمر است! — تو اگر دیگر شوی او دیگر است!
شبنمی؟ افتندگی تقدیر تست — قلزمی؟ پایندگی تقریر تست!
خاک شو نذرِ ہوا سازد ترا — سنگ شو بر شیشہ اندازد ترا![2]

''اگر ایک تقدیر سے تمھارا جی جلتا ہے تو اسے ترک کر دو اور اللہ سے دوسری تقدیر طلب کرو۔ تمھارا نئی تقدیر طلب کرنا بالکل جائز ہے، اس لیے کہ اللہ کی تقدیریں لا انتہا ہیں۔ تقدیر کے باب میں باریک سی رمز یہ ہے کہ تم بدل جاؤ تو وہ بھی بدل جاتی ہے۔ چنانچہ اگر تم شبنم بنو گے تو گرنا (پھر چوسے جانا) تمہاری تقدیر ہے اور اگر تم قلزم بنو تو تمہاری تقدیر ہے پایندہ رہنا۔ خاک بنو گے تو تقدیر ہوا کے حوالے کر دے گی۔ سنگ بنو گے

۱- بال جبریل، ص ۱۵۶/۴۴۸، ۱۵۷/۴۴۹۔
۲- جاوید نامہ، ص ۱۰۷/۶۹۵، ۱۰۸/۶۹۶۔

تو یہ تقدیر تمہیں شیشوں پر پھینک دے گی۔"

لیکن اس تلقین میں کہا یہ گیا ہے کہ نئی تقدیر کا حکم یعنی فیصلہ خدا سے طلب کرنا ہوگا۔ اللہ کے حضور دعا کرنا ہوگی تا کہ وہ نئی تقدیر کے اختیار کی توفیق دے اور صحیح تقدیر کی راہ پر ڈالے اور سمت عطا فرمائے تا کہ بہتر سے بہتر تقدیر کی طرف رستہ کھلتا چلا جائے۔ تقدیرات کی تماشا گاہ تو آنکھوں کے سامنے ہے۔ یہاں خاک کے ذرے بھی ہیں اور چٹانیں بھی، شیشے بھی ہیں پہاڑ بھی، قطرے بھی ہیں سمندر بھی، سفینے بھی ہیں اور طوفان بھی، کبوتر بھی ہیں اور شاہین بھی، گیدڑ بھی ہیں اور شیر بھی، غلام بھی ہیں اور آزاد بھی، حاکم بھی ہیں اور محکوم بھی — اور خالقِ تقدیر جاننا چاہتا ہے کہ تم کس تقدیر کے طلب گار ہو۔

آزاد کا ہر لحظہ پیامِ ابدیت
محکوم کا ہر لحظہ نئی مرگِ مفاجات[1]

دل کی آزادی شہنشاہی، شکم سامانِ موت
فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم؟[2]

مگر یہ انتخابِ تقدیر یا حتمی پسند و ناپسند پر قدرت کا مرحلہ آسانی سے نہیں آ جاتا۔ آدمی کی ہستی روح بھی ہے اور مادہ بھی۔ روح اللہ سے احکام حاصل کرتی ہے، مادہ اپنی جانب کھینچتا ہے۔ روح لطیف ہے، مادہ کثیف ہے، مادے کی کارفرمائی کے لیے گنجائش بہت زیادہ ہے — آدمی کے اندر یہ روح والا حصہ "عالم امر" کہلاتا ہے، مادی حصے کو "عالمِ خلق" کہتے ہیں۔ عالمِ امر اس رعایت سے بھی عالمِ امر کہلاتا ہے کہ ارشاد ربانی ہے "قل الروح من امر ربی" (اے رسولؐ کہہ دے کہ روح

۱۔ ضرب کلیم، ص ۵۴۰/۷۸۔
۲۔ بال جبریل، ص ۳۲۵/۳۳۔

میرے رب کا ایک امر ہے)۔ ہوس کے جملہ شعبے جن کی نمائندگی صفت حرص بھی کرتی ہے، انسان کے مادی وجود یعنی عالم خلق سے متعلق ہے۔ ہوس کے درجات سے بلند شعبے جن کی نمائندگی صفت ''ایثار'' کرتی ہے ''عالم امر'' سے تعلق رکھتے ہیں۔ لہٰذا اگر کوئی بندۂ خدا حرص کا غلام ہے تو یہ تعجب کا مقام نہیں۔ اس لیے کہ ملبے کو ملبے ہی کی طرف کشش ہوتی ہے، ہاں اگر کوئی شخص نظریاتی زندگی گزارتا ہے، فیاض ہے، ہمدرد ہے، خادم خلق ہے، صاحب ایثار ہے اور ہوس کے بندھنوں میں بندھا ہوا نہیں اور حرص و آز کے زنداں سے آزاد ہے تو پھر مقام تعجب ہے اور ایسا شخص لائق داد و تحسین ہے۔ اس لیے کہ وہ اس مقام بے نیازی اور درجۂ استغناء پر آسانی سے نہیں پہنچتا۔ وہ ریاضت و مشقت کے بغیر مادی وجود کا ''باغی'' نہیں ہو سکتا اور اس کے تسلط سے نجات حاصل نہیں کر سکتا۔ اس مشقت و ریاضت میں استقامت کسی بڑے اصول سے پکی محبت کے بغیر ممکن نہیں اور پھر ہر اصول سے اونچا اصول لا الہ الا اللہ ہے۔ بقول حضرت علامہ

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات[1]

یہ مال و دولت دنیا، یہ رشتہ و پیوند
بتان وہم و گماں! لاالہ الا اللہ[2]

مادی وجود کے انگھڑ تقاضے کسی بھی حیوان کے بنیادی تقاضوں سے کم طاقت ور نہیں ہوتے۔ ہم ان تقاضوں کو جبلتیں کہہ لیتے ہیں۔ حضرت عبدالقاہر بن عبداللہ السہروردی اپنی کتاب ''عوارف المعارف'' (یہ کتاب شہاب الدین سہروردی کی عوارف المعارف سے پہلے کی ہے) میں لکھتے ہیں۔

۱۔ ضرب کلیم، ص ۹۹/۳۷۔
۲۔ ایضاً ، ص ۷۷/۱۵۔

''فمن عرف اصول النفس و جبلاتها عرف ان لاقدرة له علیها الا باستعانة ببارئها وفاطرها ۔ فلایتحقق العبد بالانسانیة الا بعد ان یدبر دواعی الحیوانیة فیه بالعلم و العدل و هو رعایة طرف الافراط و التفریط ، ثم بذلک تتقوی انسانیتة و معناه ۔''[1]

یعنی ''جو انسان نفس کے مزاج اور اصل سے آگاہ ہے اور اس کی جبلتوں کو پہچانتا ہے ، اس کو معلوم ہے کہ وہ نفس اور اس کی جبلتوں پر اس وقت تک قابو نہیں پا سکتا ، جب تک وہ ان کے خالق اور موجد فطرت سے استعانت نہ کرے ۔ اور کوئی بندہ بھی جب تک اپنے وجود کے حیوانی تقاضوں سے علم و عدل کے ساتھ نپٹ نہیں لیتا انسانیت کے مقام پر نہیں پہنچ سکتا ۔ اور علم و عدل کی اس کاروائی کا مطلب ہے کہ افراط و تفریط پر کڑی نگاہ رکھی جائے ، جب کہیں جا کر اس کی انسانیت اور معنویت تقویت یاب ہوتی ہے۔''

حضرت علامہ لکھتے ہیں ''یوں بھی ارتقائے حیات پر نظر رکھی جائے تو یہ حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے کہ شروع شروع میں تو اگرچہ طبیعی کا نفسی پر غلبہ ہوتا ہے لیکن پھر جیسے جیسے ''نفسی'' طاقت حاصل کرتا ہے طبیعی پر چھا جاتا ہے اور اس لیے عین ممکن ہے کہ آخر الامر اس سے بالکل آزاد ہو جائے۔''[2]

آخر الامر وہ جبلت اور تسلط سے آزاد ہو جائے ، یہ بالکل ممکن ہے مگر درمیانی منزل کھینچا تانی کی منزل ہے ۔ روح اوپر کو کھینچتی ہے ، بدن نیچے کو ''کعبہ میرے پیچھے ہے کلیسا میرے آگے''۔ اکثر افراد وہ ہیں جو جبلت کے آگے ہتھیار ڈال دیتے ہیں اور

۱۔ عوارف المعارف از عبدالقادر بن عبداللہ السہروردی ، دارالکتاب عربی بیروت ، ص ۴۵۳ ۔

۲۔ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ ، ص ۱۶۱ ۔

بدن کے ہو کر رہ جاتے ہیں - قرآن کا ایسے لوگوں کے بارے میں ارشاد ہے ''ولو شئنا لرفعنٰہ بہا ولکنہ اخلد الی الارض واتبع ھوٰہ''[1] (اگر ہمیں اپنی مرضی کرنا ہوتی تو ہم اسے اپنی نشانیوں کی مدد سے اوپر کو اٹھاتے، لیکن وہ تو زمین کے ساتھ چپکتا چلا گیا اور اپنی ہوس کا بندہ ہو کر رہ گیا) -

ایک طرف مٹی کی تاثیر اور ملبے کی کشش، دوسری طرف روح خالق کے ذرات کا پرتو، صاحب ''عجائب المخلوقات'' قزوینی کے بقول ''اول مراتب ھذہ الکائنات تراب وآخرھا نفس ملکیۃ طاھرۃ''[2] یعنی ممکنات میں اول درجہ مٹی کا ہے اور آخری درجہ پاک ملکی نفس کا ہے — اس آتار چڑھاؤ اور کھینچا تانی میں ممکن ہے آدمی بے بس ہو کر رہ جائے یا ممکن ہے اندرونی کھینچا تانی کی کیفیت سے کوئی فیصلہ کر ہی نہ سکے - لہٰذا غلط کو صحیح جان کر طلب کرنے لگے - ہر فیصلہ ایک تقدیر ہے جس کے انتخاب اور اختیار کا نفع و نقصان اٹھانا پڑتا ہے - یہ تو واضح ہے کہ عالمِ خلق اور عالمِ امر ساتھ ساتھ ایک ہی وجود میں ہیں - قریب ترین ہمسائے اور ہمدم ہیں - لہٰذا ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں - جن پر حیوانیت حاوی رہتی ہے ان کی کش مکش کمزور ہو جاتی ہے اور وہ نسبتاً آرام میں رہتے ہیں مگر جو حیوانیت کی سطح سے اوپر ابھر رہے ہوں انہیں ہر وقت خطرہ لاحق رہتا ہے اور نفسِ امارہ کی جانب سے مطمئن نہیں ہو سکتے - نفسِ امارہ مرے ہوؤں کو کیوں مارے - '' نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشا کش درمیاں کیوں ہو''- نفس امارہ تو اسی کو شکار کرنے کے درپے رہے گا جسے دھر پکڑنا ضروری ہو گا، جو آزاد ہونے کی کوشش کر رہا ہو - ایسے عالم میں یوں بھی ہوتا ہے کہ نفسِ امارہ ''اوپر'' کی آواز بن کر کار فرما ہو اور سننے والا اسے فرشتے کی آواز اور

۱- قرآن کریم - سورہ ۷، آیت ۱۷٦ -

۲- الانسان فی القرآن از محمود العقاد، ص ۹۵ -

پاکیزہ الہامی اشارہ جان لے اور اس طرح گمراہ ہو کر مارا جائے۔ ممکن ہے وہی آواز سالک کو ہوس اور تکبر کی راہ پر ڈال دے۔ حضرت علامہ نے بڑے پیارے استعاروں میں یہ بات سمجھائی ہے۔

صاحبِ ساز کو لازم ہے کہ غافل نہ رہے
گاہے گاہے غلط آہنگ بھی ہوتا ہے سروش![1]

لہٰذا فاطرِ جبلت و خالقِ طبیعت سے ہر لحظہ ہدایت طلب کرتے رہنا اور بہتر تقدیر کے لیے دعا کرتے رہنا چاہیے۔

تری دعا سے قضا تو بدل نہیں سکتی
مگر ہے اس سے یہ ممکن کہ تو بدل جائے!

تری دعا ہے کہ ہو تیری آرزو پوری
مری دعا ہے تیری آرزو بدل جائے![2]

دوسرا شعر خصوصاً توجہ طلب ہے۔ علامہ کے شعر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ گویا دعا خود مانگنے والے پر اثر کرتی ہے اور اس طرح دعا کرنے والے کے اندر تبدیلی واقع ہوتی رہتی ہے اور یہ بالکل واضح ہے، وہ اس طرح کہ جب دعا مانگی جاتی ہے تو اس طرح سے خود اپنے آپ کو یاد دلایا جاتا ہے کہ یہ یا وہ مقصد حاصل کرنا ہے۔ یہ بار بار کی یاد دہانی عزم میں استقامت پیدا کرتی ہے اور پھر عزم کی استقامت کا درجہ جُوں جُوں بلند ہوتا ہے تُوں تُوں دعا مانگنے والے کی اہلیت اور معیار (category) بدلتا چلا جاتا ہے۔ اس میں اہلیت کی مقدار عزم کے معیار کے مطابق بڑھتی ہے۔ اللہ کے فیصلے نہیں بدلتے مگر وہ فیصلے نا اہل کے لیے اور ہیں اور اہل کے لیے اور۔ تقدیر تو وہی رہتی ہے مگر آدمی اپنے اندر تقدیر کے شایانِ شان استحقاق پیدا کر لیتا ہے۔ سہولتِ بیان کی خاطر ہم اس اپنی تبدیلی

۱- بال جبریل، ص ۵/۳٦٧۔
۲- ضرب کلیم، ص ٦۵/٦۲٧؛ ١٦٦/٦۲٨۔

کو تقدیر کی تبدیلی سے تعبیر کرتے ہیں ۔ تقدیر باہر سے نہیں بدلتی ، اندر سے بدلتی ہے۔

اوپر گزر چکا ہے کہ

تو اگر تقدیرِ نو خواہی رواست زانکہ تقدیراتِ حق لا انتہا است[1]

تو اگر نئی تقدیر کا طالب گار ہو تو یہ بالکل جائز ہے اس لیے کہ اللہ کی تقدیر ایک نہیں ، اس کی تقدیریں بے حد و حساب ہیں ۔ قرآن کریم میں آتا ہے: ''وخلق کل شیئ فقدرہ تقدیرا''[2] (اللہ نے ہر شے پیدا کی اور اس کا ٹھیک ٹھیک اندازہ مقرر کر دیا) ۔ ہر شے کے خواص اور امکانات اس کی تقدیر ہیں ۔ مٹی باریک ہو تو اسے ہوا اڑا لے جاتی ہے ، جم کر ٹھوس ہو جائے تو پھر آندھیاں بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں ، اس لیے کہ اس کی تقدیر بدل چکی ہوتی ہے ۔ پہلی تقدیر غبار کی تقدیر تھی ، دوسری تقدیر پتھر کی سی تقدیر بن چکی تھی ۔ مٹی پانی کو جذب کر سکتی ہے ، گرمی اور سردی کو بھی جذب کر سکتی ہے ، وغیرہ وغیرہ درجنوں امکانات ہیں اور یہ سب خاک کی تقدیریں ہیں ۔ خاک کی ہر تبدیلی تقدیر کی تبدیلی ہے ۔ پتھر شیشے سے ٹکرائے تو کیا کیفیت ہوتی ہے ۔ وہی پتھر بکھر جائے تو بے شک اسے بھی ہوا اڑا لے جائے ۔ پانی کے عمودی امکانات ظاہر ہیں ۔ ایک خاص درجے پر سرد ہو کر منجمد ہو جائے تو اس کی تقدیر چٹانوں کی اور فرشِ سنگ کی تقدیر اور ایک خاص درجے پر گرم ہو کر بخار بن جائے تو اس کی تقدیر ہوا کی تقدیر ہوتی ہے ۔ لوہے میں آگ سمائی ہو تو آگ کی طرح جلانے لگتا ہے اور زیادہ گرم ہو جائے تو موم کی طرح ہر صورت میں ڈھلنے لگتا ہے ۔ موم منجمد ہو جائے تو اس کا تقدیری رشتہ سنگ سے استوار ہو جاتا ہے ، پھر وہ ٹوٹ تو سکتی ہے مگر

۱- جاوید نامہ ، ص ۶۹۵/۱۰۷ -
۲- قرآن کریم - سورہ ۲۵ ، آیت ۲ -

مختلف شکلوں میں ڈھل نہیں سکتی۔ غرض ہر شے کے امکانات کا صحیح اندازہ اس کی تقدیر ہے اور ہر شے میں جو جو تبدیلی واقع ہو اُسے ہم تبدیلیٔ تقدیر کہہ سکتے ہیں۔ اسی طرح نباتی تقدیریں اور حیوانی تقدیریں ہیں، بے حد و حساب، لا انتہا۔ آدم میں مشاہدہ و تجربہ سے متاثر ہونے کی اہلیت موجود ہے اور خواصِ اشیاء سے آگاہی اس کی وہ فضیلت ہے جس نے اس کے رُوبرو فرشتوں کو عاجز کر دیا تھا، اگر علم و آگہی کی بے پناہ وسعت کے باوصف، وہ اپنے لیے کوئی بہتر معیار اور پیمانہ مقرر نہیں کر سکتا تو گویا وہ اپنی تقدیری صلاحیتوں کو کام میں لانے سے قاصر رہا۔

ہر شے صورت اور وضع کی تبدیلی کے ساتھ گویا تبدیلیٔ تقدیر کا مزا دیتی ہے۔ ابن مسکویہ لکھتے ہیں: ”فان الفرس اذا قصر عن کمالہ ولم تظہر افعالہ الخاصۃ بہ علیٰ افضل احوالہا حط عن مرتبۃ الفرسیۃ واستعمل بالاکاف کما تستعمل الحمیر و کذلک حال السیف و سائر الآلاتِ متی قصرت و نقصت افعالہ الخاصۃ بہا حطت عن مراتبہا و استعملت استعمال مادونہا“[1]

یعنی جب گھوڑا اپنا کمال کھو بیٹھتا ہے اور اس کی طرف سے وہ افعال بروئے کار نہیں آتے جو اس کے بہترین احوال میں بروئے کار آنے چاہئیں تو وہ اپنا ”گھوڑا پن“ کھو بیٹھتا ہے اور پھر اس پر پالان ڈال کر اُسے اسی طرح استعمال کیا جانے لگتا ہے جس طرح گدھوں کو۔ یہی حال شمشیر اور دیگر آلات کا ہے کہ جب، وہ اپنے افعالِ خاصہ کی بجا آوری میں کوتاہ اور کم عیار ثابت ہو تو اپنے مرتبے سے گر جاتی ہے اور کمتر مرتبے کی چیزوں کی طرح برتی جانے لگتی ہے۔

۱- تہذیب الاخلاق، دار مکتبة الحیاة بیروت، ص ۱۶ -

گھوڑا اپنے کمالِ خواص کے عالم میں بڑی شان دار سواری ہے ، وہ اپنے مالک کے لیے نشانِ عزت ہے لیکن محروم کمال ہو تو اس پر بھی اینٹیں ، چارہ اور کوڑی لادی جانے لگتی ہے ۔ بالفاظ دیگر اس کی تقدیر گھوڑے کی تقدیر نہیں رہتی ، بلکہ وہ گدھے کی تقدیر کا مالک بن جاتا ہے ۔ شمشیر اگر شمشیر کا خاصہ کھو بیٹھتی ہے تو پھر کمتر مرتبے کی چیزوں میں ڈھلنے لگتی ہے ، کھرپا وغیرہ بن جاتی ہے ، اور ظاہر ہے کہ شمشیر کی تقدیر اور ہے ، کھرپے اور درانتی کی تقدیر اور ۔ شمشیر والا غازی کہلاتا ہے اور کھرپے والا گھسیارا ۔ آپ نے بارہا دیکھا ہوگا کہ جو بھینس خشک اور نازا ہو جائے (جسے پنجابی میں پھنڈر کہتے ہیں) اس کی نازبرداری کوئی نہیں کرتا ۔ اس کے چارے ، پانی اور نہلانے دھلانے اور ٹہل سیوا کا وہ اہتمام ختم ہو جاتا ہے جو اس کے بھینسوی خواص یا امکانات کے باعث عمل میں آتا ہے ۔ چنانچہ اسے یا تو قصائی کے حوالے کر دیا جاتا ہے یا بیل کے ساتھ ہل میں جوت دیا جاتا ہے اور پھر وہ جب تک یہ کام کرتی رہتی ہے اس کی تقدیر وہی ہوتی ہے جو بیل کی تقدیر ، گو شکل بھینس ہی کی رہتی ہے ۔ بھینس ، گدھا ، گھوڑا ، گدھ ، عقاب ، گیدڑ ، شیر ، الماس ، شبنم ، غبار ، آہن غرض کہ ہر شے کے امکانات کے بارے میں بر بنائے تجربہ و مشاہدہ جو تخمینہ و اندازہ قائم کیا جا سکتا ہے وہ اس شے کی تقدیر ہے ، اور تقدیر کا یہ مفہوم حضرتِ علامہ نے بلا شک قرآن کریم سے اخذ کیا ۔ ”و القمر قدرنٰہ منازل حتی عاد کالعرجون القدیم“[1] ۔ ”و خلق کل شیء فقدرا تقدیرا“[2] اس طرح واضح ہو جاتا ہے کہ

١- قرآن کریم ۔ سورہ ٣٦ ، آیت ٣٩ ۔

٢- ” ” ۔ سورہ ٢٥ ، آیت ٢ ۔

رمز باریکش بحرفے مضمر است
تو اگر دیگر شوی ، او دیگر است![1]

الغرض حضرتِ علامہ کے تصورِ تقدیر سے جو تلقین ہمیں حاصل ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ جملہ معیار اور پیمانے آپ کی آنکھوں کے سامنے ہیں ۔ گویا امکانات و تقدیرات کا کارخانہ کھلا ہے ۔ خلوص کے ساتھ تقدیر انتخاب کیجیے اور پھر اس تقدیر کے حصول کی خاطر اپنے اندر اہلیت پیدا کیجیے ۔ تقدیرات بہتر سے بہتر موجود ہیں ۔ لٰہذا بہتر سے بہتر کی طرف بڑھتے جائیے اور تبدیلیٔ تقدیر کے باب میں اللہ کے حضور دعا گو رہ کر توفیق طلب کرتے رہیے ۔ ''خودی کا نصب العین یہ نہیں کہ کچھ دیکھیے بلکہ یہ کہ کچھ بن جائیے ۔''[2]

نشاں یہی ہے زمانے میں زندہ قوموں کا
کہ صبح و شام بدلتی ہیں ان کی تقدیریں[3]

۱- جاوید نامہ ، ص ۶۹۵/۱۰۷ -
۲- تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ ، ص ۳۰۶ -
۳- ارمغانِ حجاز (اردو) ، ص ۶۸۴/۳۲ -

عذابِ دانشِ حاضر سے باخبر ہوں میں
کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثلِ خلیل[۴]

علامہ اقبال اور ابراہیمی[۴] نظر

ہر شاعر جو صحیح معنوں میں صاحبِ وجدان ہے ایک ایسی نگاہ کا مالک ہے جو عام افراد کی نگاہ سے مختلف ہوتی ہے۔ لہٰذا کارخانۂ قدرت میں پائی جانے والی بے حساب صورتیں شاعر کو اس طرح دکھائی نہیں دیتیں جس طرح وہ ہیں یا جس طرح وہ کسی عام شخص کو دکھائی دیتی ہیں۔ علاوہ ازیں شاعر کی نگاہ صورت سے معنٰی کی طرف اس سُرعت سے سفر کرتی ہیں کہ اُسے صورت ہی میں معنٰی کا جلوہ رقصاں نظر آتا ہے بلکہ ایک صورت میں کئی کئی جلوے۔ شاعر اور غیر شاعر میں جو بنیادی فرق ہیں ان میں سے یہ ایک نمایاں فرق ہے۔ بالفاظ دیگر یوں کہہ لیجیے کہ ایک سچے شاعر کی آنکھ اشیاء کی صورت کے بجائے معنٰی کو دیکھتی ہے۔ مثلاً ایک شاعر کے لیے گل و خار کا منظر اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ گل گل ہے اور خار خار، مگر اس کے برعکس شاعر کی نظر گل و خار کے آئینے میں زندگی کے گلستانِ مسرت اور خارستانِ غم کے جلووں سے مسرور اور رنجور ہوتی ہے۔ بہار اور خزاں، جوانی اور بڑھاپا، اُمید اور مایوسی، دھوپ اور چھاؤں، فتح اور شکست، خندہ اور آہ — غرض تخیل کے تازی کو ایک ننھے سے منظر کی ایڑ اس طرح بھڑکاتی ہے کہ اس کے فراٹے آن کی آن میں جہانِ معنٰی کی سیر کر آتے ہیں۔ اسی طرح ایک قطرۂ شبنم ایک غیر شاعر کے لیے تو پانی کی ایک بوند ہے مگر شاعر کی آنکھ اس قطرے کی بدولت ایک طرف دریاؤں، سمندروں، طوفانوں، سفینوں، گردابوں، نہنگوں، ناخداؤں اور ساحلوں سے مکالمات کر آتی ہے اور دوسری

جانب وہ موتیوں ، موتیوں کے طرّوں اور ہاروں ، ستاروں ، قہقہوں ، حسیناؤں کے چمکتے دانتوں ، آنسوؤں ، پھر خوشی کے آنسوؤں اور غم کے آنسوؤں ، تابندہ ساغروں ، شراروں ، آفتابوں ، مہتابوں اور پھر اُن سب کی زوال آمادگی اور فنا کے مراحل ناپ آتی ہے ۔ اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ ایک شاعرِ صادق کے لیے صورتیں ایک دوسری سے منفک نہیں بلکہ پوری کائنات ایک بغایت مضبوط سلسلہ ہائے صور و معانی میں مربوط ہے ۔ اسی سے یہ بھی مستنبط ہوتا ہے کہ عام سے عام سی شے بھی بزمِ کائنات کے مہمانِ خاص کی حیثیت رکھتی ہے ۔ مرزا غالب کا مشہور شعر ہے ۔

قطرے میں بحر دکھائی نہ دے اور جزو میں کل
کھیل بچوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا !

لیکن کسی شاعرِ صادق کی بات منظر کی دقت ، شعور کی حدت اور احساس اور جذبے کی شدت پر ختم نہیں ہوتی ۔ اس سے بہت زیادہ اہم مسئلہ اپنی نظر ، اپنے شعور اور اپنے احساس اور جذبے کو دوسروں تک پہنچانا ہے ۔ ہر سفر پر دوسروں کو ساتھ لے کے چلنا ہے اور جو کچھ دیکھنا ہے وہی دوسروں کو دکھانا ہے ۔ اپنے ساتھ ہنسانا اور رُلانا ہے ۔ ذہنوں میں آترنا اور دلوں میں سمانا ہے ۔ اپنا تامل اور اپنا یقین دوسروں کے دلوں میں منتقل کر دینا ہے ۔ یہ وہ وصف ہے جسے ادبی اصطلاح میں ابلاغ کہا جاتا ہے ۔ اگر ابلاغ کا جوہر موجود نہیں یا ناقص ہے تو ایک شخص بے شک گوناگوں وجدانات اور حسیات کی کائنات بنا رہے مگر شاعر نہیں کہلا سکتا ۔ شاعر تو روحِ کون و مکان کی پُر تاثیر زبانِ ترجمان کا نام ہے اور اسی تاثیر کی وسعت اور تنگی کے مطابق شاعر کی شخصیت پھیلتی اور سکڑتی ہے ۔ آیا وہ فقط چند ہی لوگوں کو جو ایک خاص ذہنی سطح پر ہیں اور ایک خاص زاویۂ نظر کے مالک ہیں متاثر کر سکتا ہے یا وہ ہر طرح کے اور ہر دور کے انسان کا ہمدم و ہمراز بن سکنے کا

اہل ہے ۔ وہ جب ہر طرح کے دور کا اور ہر دور کے انسان کا ہمدم اور ہمراز بن جائے تو وہ زمانی اور مکانی ہونے کے بجائے لازمانی اور لامکانی ہو جاتا ہے ۔

سطور آئندہ میں ہم یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ علامہ اقبال نے حضرت ابراہیمؑ کی نظر کا سفر کن آنکھوں سے دیکھا اور پھر کس طرح اس سفر سے معانی کے تحفے چُن کر لے آئے ، وہ تحفے جو بڑے دل جُو ، حوصلہ افزا ، نظر افروز اور ایمان آموز ہیں ۔ ہمیں معلوم ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے والد آذر بُت گر تھے اور ان کے بنائے ہوئے بُتوں کو اُن کی قوم پوجتی تھی ۔ حضرت ابراہیمؑ نے ہوش سنبھالا تو ان بُتوں کو توڑنے لگے ، جب قوم نے اپنے خداؤں کو مجروح اور شکستہ حالت میں پایا تو حضرت ابراہیمؑ کی سزا کے درپے ہوئی ۔ قوم کے بادشاہ نے انہیں آگ میں جلائے جانے کی سزا دی مگر بفضلِ الٰہی آگ گلزار میں تبدیل ہو گئی اور حضرت ابراہیمؑ صحیح و سالم رہے ۔ آگے چل کر قرآن کریم میں یہ ارشاد ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے خواب میں دیکھا کہ وہ اپنے بیٹے اسمٰعیل کو ذبح کر رہے ہیں ۔ یہ خواب انہوں نے اپنے بیٹے سے بیان کیا ۔ بیٹے نے عرض کیا ”ابا جان ۔ آپ خواب کو عملاً سچ کر دکھائیں ۔ میں بڑی ثابت قدمی سے جان کا نذرانہ پیش کر دوں گا“۔ حضرت ابراہیمؑ نے بڑھاپے میں اپنے معصوم فرزند کی گردن پر چُھری رکھ دی مگر اللہ کو تو صداقت اور خلوص کی آزمائش مقصود تھی اور بس ۔ حضرت اسمٰعیل کی جگہ کوئی اور وجود قربان ہو گیا ۔ ساتھ ہی قرآن کریم نے اس امر سے بھی آگاہ کیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اللہ کے حکم پر اپنی ایک بی بی اور فرزند حضرت اسمٰعیلؑ کو ایک بے آب و گیاہ قطعۂ زمین میں چھوڑ دیا اور پھر اسی قطعۂ زمین میں تعمیرِ کعبہ مکرمہ عمل میں آئی جو بُت کدوں سے معمور کائنات میں خداؔ کا پہلا گھر تھا ۔

دنیا کے بُت کدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا
ہم اس کے پاسباں ہیں، وہ پاسباں ہمارا[1]

رہی ابراہیمی نظر تو یہ حضرت ابراہیمؑ کی نظر کے ایک سفر کی روداد ہے - یہ روداد قرآن کی ''سورہ انعام'' کی آیات ۷۶ تا ۸۰ میں بکمال اجمال بیان ہوئی ہے اور وہ یوں ہے -

''اور پھر جب اُس (ابراہیمؑ) کو رات نے آن لیا تو اس نے ایک ستارہ دیکھا اور کہا یہ ستارہ میرا رب ہے، جب وہ ستارہ ڈوب گیا تو کہا، میں ڈوبنے والوں کا دوست نہیں ہو سکتا، پھر اس نے چاند چمکتا دیکھا اور کہا یہ میرا رب ہے، مگر جب چاند ڈوب گیا تو بولا میرا رب مجھے سیدھی راہ نہ دکھا دے گا تو میں بھی گمراہوں میں پایا جاؤں گا، پھر جب سورج کو چمکتے دیکھا تو کہا یہ میرا رب ہے یہ بڑا ہے - اور جب وہ بھی ڈوب گیا تو کہا اے میری قوم میں ان سے جن کو تم شریک (خدائی میں شریک) بناتے ہو بَری اور بیزار ہوں اور میں نے یکسوئی کے ساتھ ہر شے سے منہ موڑ کر اس کی طرف کر لیا ہے جس نے آسمان بنائے اور زمین بنائی - میں خدا کے ساتھ کسی اور کو شریک ٹھہرانے والا نہیں''[2]۔

قرآن میں اس امر کی طرف کوئی اشارہ موجود نہیں کہ حضرت ابراہیمؑ کا یہ مشاہدہ و ملاحظہ یا سفرِ نظر جب عمل میں آیا تو اس وقت ان کی عمر کیا تھی - بہرحال وہ اس عمر کو پہنچ چکے تھے کہ طلوع و غروب سے عبرت اندوز ہو سکیں - گویا نظر بالغ ہو رہی تھی - اب یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ جس روز کا ذکر ہے کہ رات چھا گئی اور ابراہیمؑ نے ستارہ دیکھا - کیا حضرت ابراہیمؑ نے پہلی بار اسی دن شام کا اندھیرا اور ستارے کا جلوہ دیکھا تھا؟ حضرت ابراہیمؑ کسی زیر زمین کمرے میں نہ تو پلے تھے کہ

۱- بانگِ درا، ص ۱۵۹/۱۵۹ -
۲- قرآن کریم - سورہ ۶، آیت ۷۶، ۷۷ -

ایک عمر کے بعد برآمد ہوئے اور برآمد ہونے کے بعد پہلی بار ستارہ ، چاند اور سورج دیکھا ۔ وہ تو جب سے پیدا ہوئے تھے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے ۔ جب نظر بالغ ہوئی تو گہرا مطالعہ شروع کیا اور مشاہدے کی راہ سے خدا تک پہنچے ۔ یہ مشاہدہ بصارت کا نہ تھا ، یہ بصیرت کا مشاہدہ تھا ۔ اس طرح ہم آن اشیائے مشہود کو علامات تصور کر سکتے ہیں اور یہ مفہوم اخذ کر سکتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ نے درجہ بدرجہ بے شمار ہستیوں کو دیکھا جو کائنات میں جلوہ فرما اور مصروف کار ہیں مگر کسی کا بھی عروج بحال اور قائم نہیں رہتا ۔ چیزیں اُبھرتی ہیں اور ڈوب جاتی ہیں ۔ للہذا انہوں نے اپنے اصل الاصول کی جانب راہ پائی کہ رب اور خالق ان اشیائے کائنات جیسا نہیں ہو سکتا اور ان اشیائے کائنات کو اس سے کسی قسم کی کوئی برابری کی نسبت نہیں ہو سکتی ۔ خدا وہی ہے جو غروب نہ ہو ۔ غروب ہو جانے والی یعنی غیر ثابت اور ناپائدار شے خالق کے مقابل نالائقِ توجہ اور غیر اہم ہے ۔ لہٰذا اُسے خالق کی مرضی اور حکم پر قربان کیا جا سکتا ہے ۔ علامہ اقبال کے نزدیک اس عبرت گیر ، نتیجہ رس ، جرأت آموز اور حقیقت شناس نظر کا نام ابراہیمی نظر ہے ۔

براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چُھپ چُھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں ![1]

اس شعر کا مفہوم اوپر بیان کردہ پس منظر کے بغیر بخوبی واضح نہیں ہو سکتا ، اس لیے کہ اس شعر میں سب سے اہم چیز جو سمجھنے کی ہے وہ ابراہیمی نظر ہے ۔ یہاں یہ امر بھی پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ حضرت ابراہیمؑ کے اہلِ وطن بابلی و کلدانی لوگ سیارہ پرست تھے ۔ وہ سیاروں کو تقدیر کا مالک جانتے تھے ۔ فلاں ستارہ مبارک ہے ، فلاں منحوس ہے ، فلاں شخص کی پیدائش فلاں

۱۔ بانگ درا ، ص ۲۷۱/۲۷۱ ۔

ستارے کے زیر اثر ہوئی ہے لہٰذا وہ حتماً ایسا اور ایسا شخص ہو گا۔ مگر ابراہیمی نظر کا فیضان حاصل کرنے والی فکر اس طرح سوچے گی۔

ستارہ کیا مری تقدیر کی خبر دے گا
وہ خود فراخیٔ افلاک میں ہے خوار و زبوں![1]

لہٰذا سیاروں کی ناپائداری کو اس پس منظر میں مزید معنویت حاصل ہو جاتی ہے۔ پھر حضرت ابراہیمؑ نے اپنے باپ کے بنائے ہوئے بُت توڑ دیے تھے لہٰذا علامہ اقبال نے ہر طرح کے بُتوں کو مسمار کرنے والی باخدا قوت کے لیے ابراہیمؑ اور ابراہیمی کو علامت بنا لیا۔ شعر ذیل میں ابراہیمِ عشق کا استعارہ بھی اس امر کی علامت ہے۔

توڑ دیتا ہے بتِ ہستی کو ابراہیمؑ عشق
ہوش کا دارو ہے گویا مستیٔ تسنیمِ عشق[2]

واضح رہنا چاہیے کہ شعر بانگِ درا کے دوسرے حصے میں وارد ہوا ہے اور یہ علامہ اقبال کا پہلا شعر ہے جس میں حضرت ابراہیمؑ کا حوالہ دیا گیا ہے۔ بانگِ درا کے پہلے حصے میں جو ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۵ء تک کے عرصہ کے کلام پر مشتمل ہے ایسا کوئی حوالہ نہیں ملتا۔ حالانکہ سینا، طُور، کلیمؑ، حضرت عیسیٰؑ اور حلاج منصور کا ذکر موجود ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس دور میں ابھی علامہ اقبال خود بھی ستاروں، مہتابوں، اور آفتابوں کے نظارے میں مشغول تھے۔ گویا ان کی نظر پر ابھی بصارت حاوی تھی اور وہ بصارت ابھی بصیرت نہ بنی تھی۔ یہ شعر جس نظم کا حصہ ہے اس کا عنوان ہے ''سوامی رام تیرتھ''۔ سوامی رام تیرتھ ایک ہندو عالم تھے، مزاج درویشانہ تھا۔ وہ حقیقت الحائق کی جستجو میں رہے، تسلی نہ ہوئی، سوچا اس خاکی جسم کے بندھنوں

۱۔ بال جبریل، ص ۳۱۹/۲۷۔
۲۔ بانگِ درا، ص ۱۱۴/۱۱۴۔

سے آتما کو مکتی دلا دیں تو شاید ان کی آتما کا پرماتما سے میل ہو جائے ۔ اسی دھن میں وہ دریائے گنگا پر گئے اور اشنان کرتے کرتے دور نکل گئے ، سورگ کی طرف ۔ یہ ۱۹۰۶ء کا واقعہ ہے[1] ۔

جب ابراہیمی[4] کا مفہوم بت شکنی ، ناپائدار سے کنارہ کشی اور لازوال سے لگاؤ کے طور پر علامہ اقبال کے یہاں متعین ہو گیا تو پھر اس کا استعمال خوب خوب ہوا ۔ مثال کے طور پر یہ شعر ملاحظہ ہوں ۔

صنم کدہ ہے جہاں اور مرد حق ہے خلیل[4]
یہ نکتہ وہ ہے کہ پوشیدہ لاَ الٰہ میں ہے ![2]

باش مانندِ خلیل اللہ مست ہر کہن بت خانہ را باید شکست[3]

قرآن کریم میں آتا ہے کہ تم نے وہ شخص تو دیکھا ہی ہوگا جس نے اپنی خواہشات کو اپنا خدا بنا لیا اور پھر وہ اللہ کے حکم سے جانتا بوجھتا گمراہ ہوگیا (سورۃ جاثیہ ، آیت ۲۲) ۔ اس اعتبار سے دیکھیں تو دنیا کی ہر وہ شے جس کی تمنا اور محبت خدا سے غافل کر دے ایک چھوٹا سا خدا ہے ، وہ صنم ہے گو وہ باطل ، غیر ثابت اور زوال پذیر ہے ۔ خدا واحد ہے ۔ خدا کے سوا کائنات میں جو کچھ ہے اسے کثرت کہتے ہیں ۔ خود اپنا جسم ، اپنی اولاد ، مال ، منصب ، ذاتی غیرت ، ذوق جاہ ، ہوس وغیرہ ہر شے کثرت ہے ۔ لہٰذا یہ جہاں صنم کدہ ہے کہ اس میں موجود ہر بت خدا سے غافل کر دیتا ہے ۔ پھر اس دنیا میں جو شخص بھی خدائے واحد پر پختہ ایمان رکھتا ہے وہ مرد حق ہے ۔ گویا وہ غیر خدا کے وجود کو خدا کی محبت اور حکم کی موجودگی میں کوئی اہمیت نہیں دیتا ۔ چنانچہ اس کا عمل ایک طرح سے حضرت ابراہیم[4] کا سا ہو جاتا ہے

---

1. N.B. SEN; Punjabs Eminent Hindus, Pp. 272, 273.

۲- بال جبریل ، ص ۳۶۰/۶۸ ۔

۳- پس چہ باید کرد ، ص ۸۰۳/۷ ۔

جنہوں نے ہر شے سے منہہ موڑ کر اور یکسو ہو کر رخ خدا کی طرف کر لیا - ظاہر ہے کہ منزل اسی وقت حاصل ہوتی ہے جب لا الہ پر پختہ اعتقاد ہو -

یہ مال و دولتِ دنیا ، یہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گماں ! لا الہ الا اللہ
یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں ، لا الہ الا اللہ
اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکمِ اذان لا الہ الا اللہ[1]

اسی لا الہ اور حق کے مقابل باطل ہے - باطل ناپائدار اور بے بنیاد شے کو کہتے ہیں - چونکہ خدا کے سوا ہر شے آفل (غروب ہونے والی) ہے لہذا آفل ، باطل ، زائل ، فانی وغیرہ کلمات ہم معنٰی ٹھہرتے ہیں - علامہ اقبال نے لا اُحب الا'فلین (میں غروب ہو جانے والوں کا دوست اور طلب گار نہیں) کا مفہوم اتنا وسیع کر دیا ہے کہ ہر فانی شے کو ''آفل'' کے پلڑے میں ڈال دیا ہے - مولانا جامی نے 'نفحات الانس' میں حضرت ابراہیم بن فاتک کے احوال میں شیخ الاسلام حضرت عبداللہ انصاری کا قول نقل کیا ہے کہ صوفیوں کی توحید ہے ''نفی الحدث و اقامۃ الازل ، یعنی حدوث کی نفی کر دینا اور ازل کو قائم کرنا''- علامہ اقبال نے یہ بات یوں کہی ہے -

علمِ مسلم کامل از سوزِ دل است معنیٔ اسلام ترکِ آفل است[2]

یعنی اسلام کا تو مفہوم ہی یہ ہے کہ ہر ماسوا اللہ کی محبت اور

۱- ضرب کلیم ، ص ۴۷۸،۴۷۷/۱۶،۱۵ -
۲- اسرار خودی ، ص ۶۷/۶۷ -

پرستش ترک کر دی جائے اور یہ آگاہی سوزِ دل کے بغیر ممکن ہی نہیں اس لیے کہ وہ فقط عشقِ الٰہی ہے جو ایسی آگاہی کو ممکن بناتا ہے۔

چوں زبندِ آفل ابراہیم رست | درمیاں شعلہ ہا نیکو نشست[1]

یعنی جب ابراہیمؑ ہر فانی شے کی محبت سے دستبردار ہو گئے اور ان کی محبت فقط اللہ کے لیے رہ گئی تو انہوں نے شعلوں کے درمیان بھی بعافیت نشست جمالی۔ آگ کی پروا حکمِ الٰہی کے مقابل کیا حیثیت رکھتی تھی۔ اللہ باقی --- باقی فانی، حتٰی کہ ان کا اپنا وجود بھی، وہ بھی تو آفل تھا، گویا انہوں نے مادی وجود کو اپنے جہانِ روح سے خارج کر دیا۔ آگ مادے کو جلا سکتی ہے، نہ کہ روح کو۔ پھر حضرت ابراہیمؑ تو روحِ مجسم تھے، آگ کیا نقصان پہنچاتی۔ اسی مفہوم کو شعرِ ذیل میں بیان کیا گیا۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی[2]

یہ شعر اس امر کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے کہ احکامِ الٰہی کی تعمیل میں عقلی تخمین و ظن ٹھیک رہبری نہیں کر سکتا۔ عشق کے فیصلے عقلی احکام سے قطعاً مختلف ہیں؛ وہاں کوئی مصلحت راہ نہیں پا سکتی۔ اس لیے کہ عقل ہزار مخلص ہونے کے باوصف مصلحت بیں ہی رہتی ہے بلکہ مصلحت بینی ہی کو عقل کی پختگی کا نشان سمجھا جاتا ہے۔

یہ آفل (غروب ہو جانے والا) اور فانی ہونے کا اصول اولاد پر بھی اسی طرح صادق آتا ہے جس طرح اللہ کی ذات کے سوا باقی ہر شے پر، ظاہر ہے کہ اولاد بھی اس اصول کی زد سے نہیں بچ

۱۔ اسرارِ خودی، ص ۶۸/۶۸۔
۲۔ بانگِ درا، ص ۲۷۸/۲۷۸۔

سکتی - اپنی جان بہت عزیز ہوتی ہے مگر بوڑھے باپ کے لیے معصوم اور بھولا بھالا بیٹا تو خود اپنی جان سے بھی بدرجہا عزیز تر ہوتا ہے - اولاد کے تحفظ میں والدین جانیں کھپا دیتے ہیں - تاہم محبت کی شدت کے درجات ہیں اور اسی شدت کے مطابق ترجیہات بھی ہیں - ایک سچا عاشقِ الٰہی رضائے الٰہی پر اپنی عزیز ترین متاع بصد مسرت وار سکتا ہے اور اس کے باوصف یہ نہیں سمجھتا کہ اس نے کوئی خدمت کی ہے ، اس لیے کہ اللہ تو کسی خدمت یا قربانی کا محتاج نہیں - اسے تو دلوں کا خلوص دیکھنا ہوتا ہے اور اللہ تک دلوں کا خلوص ہی پہنچتا بھی ہے - خلوص اور ناخلوص کا فیصلہ آزمائش کرتی ہے - قرآن کریم میں آتا ہے ''و من الناس من یعبد اللہ علٰی حرف فان اصابہ خیر اطمئن بہ و ان اصابتہ فتنۃ انقلب علٰی وجہہ خسر الدنیا و الاخرۃ ذٰلک ھو الخسران المبین''[1] (لوگوں میں ایسا شخص بھی پایا جاتا ہے جو عین کنارے پر کھڑا اللہ کی عبادت کرتا ہے - جب تک بھلائی اور نعمت میسر رہے اللہ کے بارے میں مطمئن رہتا ہے اور جب آزمائش کی گھڑی آن لے تو پھر پیٹھ دکھا دیتا ہے - اس نے دنیا بھی کھوئی اور عقبٰی بھی اور یہی ہے کھلا اور واضح گھاٹا -)

گویا اگر آدمی کے احوال حسبِ دلخواہ اور بخیر و خوبی ہیں تو اللہ ہے اور اس کے بندے ہونے کا دعویٰ بھی کیا جا سکتا ہے اور اگر کوئی امتحان کا مرحلہ آن پڑا اور اللہ کی محبت میں کسی اور محبت کو قربان کرنے کی ضرورت جلوہ گر ہوئی تو بھاگ نکلے - ظاہر ہے کہ ایسے لوگ دنیا کے رہے نہ دین کے - اور قرآن کریم میں ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے - ''یثبت اللہ الذین اٰمنوا

۱- قرآن کریم - سورۃ ۲۲ ، آیت ۱۱ -

بالقول الثابت فی الحیٰوۃ الدنیا و فی الاٰخرۃ"[۱] (اللہ ان لوگوں کو دنیا میں بھی اور عقبیٰ میں بھی پائداری اور استحکام عطا کرتا ہے جو پکی بات والے ہیں ۔) اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ غلط مؤقف پر اڑیں اور اسے پکی بات جانیں ۔ پکی بات سے مراد وہ بات ہے جو اصول اور سچائی پر مبنی ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور پھر لا الٰہ الا اللہ ، اللہ ایک ہے اور اس کے سوا اور کوئی اللہ نہیں ، تو سب سے بڑا اصول بلکہ اصل الاصول جو اس پکی بات پر قائم رہے اسے سب سے بڑی آزمائش اور سب سے بڑی قربانی کے لیے تیار رہنا ہوگا جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ کے مؤقف سے ظاہر ہے ۔ انہوں نے جب یہ کہا تھا کہ میں ہر شے سے منہہ موڑ کر اپنی توجہ کا رخ اللہ کی طرف کر رہا ہوں تو یہ بڑی پتے کی بات اور پکی بات تھی ، اللہ کے بندوں کا رخ اللہ ہی کی طرف ہونا چاہیے ۔ چنانچہ حضرت ابراہیمؑ آگ میں کود گئے اور جب بیٹے کی قربانی کا اشارہ ہوا تو بیٹے کی گردن پر خود اپنے ہاتھ سے چھری رکھ دی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چنانچہ علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ جو بھی "لا الٰہ الا اللہ" کی سلطنت میں آن بستا ہے وہ زن و اولاد کے بندھن سے آزاد ہو جاتا ہے ، اس لیے کہ اللہ کے سوا ہر شے سے منہہ موڑ لیتا ہے اور پھر اگر آزمائش کی گھڑی آ جائے تو وہ آزمائش پر بخوبی پورا اُترتا ہے ۔

ہر کہ در اقلیمِ لا آباد شد — فارغ از بندِ زن و اولاد شد
می کند از ما سوای قطعِ نظر — می نہد ساطور بر خلقِ پسر[۲]

یہ تھی حضرت ابراہیمؑ کی شانِ حنیفی اور یہ ہے علامہ اقبال کی تشریح "آفل" اور تعبیر "ابراہیمیؑ"۔ اسی سپردگی کے باعث اور اسی کمال عشق و استقامت کے باعث اللہ تعالیٰ نے انہیں خلیل کا مقام عطا فرما دیا ۔ یعنی قریبی دوست ، اللہ کا قریبی دوست ، وہ اللہ

۱۔ قرآن کریم ۔ سورۃ ۱۴ ، آیت ۲۷ ۔
۲۔ اسرار خودی ، ص ۴۲/۴۳ ۔

جو کائنات کی ہر شے سے بے نیاز ہے، اس نے ابراہیمؑ کو اپنا دوست قرار دے دیا اور قرآن کے ذریعے اس دوستی کا اعلان بھی کر دیا۔ یہی نہیں بلکہ دینِ فطرت یعنی دینِ اسلام کو ملتِ ابراہیمیؑ کا نام دے دیا اور ظاہر ہے کہ ابراہیمی ملت کو عیدالاضحٰی پر قربانی کرنے کا جو حکم دیا گیا ہے وہ اپنے خلیلؑ کی اسی ادائے خلوص کی یاد کو تازہ رکھنے کے لیے ہے۔ اس اعتبار سے قربانی ایک محبت کی رمز ہے اور محبت کی اس رمز کو ''یادِ یار'' ہی کے طور پر دیکھنا چاہیے، اسے لاکھوں روپوں کے ضیاع کے حساب سے نہیں دیکھنا چاہیے اور لاکھوں من گوشت کی بربادی کے پیمانے سے نہیں ناپنا چاہیے۔ یہ تو اس ''ملت'' حنیفی کے اقرار کی علامتی تجدید ہے کہ اے خدا تیرے احکام اور تیری محبت ہر شے سے برتر ہے۔ اگر تیرے احکام اور تیری محبت کا کسی بھی اور کے حکم یا محبت سے تصادم ہو گیا تو پہلی صورت ہی کو ترجیح حاصل ہوگی۔ دین کا تصادم کسی جگہ کی محبت سے ہو، عزیزوں اور دوستوں کے لگاؤ سے ہو، مال کی الفت سے ہو یا اولاد کی محبت سے، فوقیت اور تقدم دین ہی کو حاصل ہوگا۔ باقی ہر شے دین پر واری جائے گی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ساتھ ہی دل میں اس کامل یقین کو آباد رکھنا ہوگا کہ اگر حضرت ابراہیمؑ کے خلوص کا کچھ حصہ ہمارے پاس بھی ہوگا تو اس خلوص کا نور آزمائش کی ہر آگ کو گلزار بنا دے گا۔ کوئی تکلیف نہ محسوس ہوگی۔ ہر تکلیف اُلٹا فرحت کا سامان ہوگی۔ بالفاظِ علامہ اقبال

آج بھی ہو جو ابراہیمؑ کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا[1]

خدا کے سوا ہر شے کو آفل جاننا اور خدا کے سوا ہر شے کی محبت کو جو اللہ کے حکم سے متصادم ہو بت سمجھنا اور اس کو

۱۔ بانگِ درا، ص ۲۰۵/۲۰۵۔

توڑ کے رکھ دینا وہ مضمون ہے جو حق کی جستجو اور جرأت اظہار کی علامت بن کر علامہ اقبال کے کلام میں رنگ بدل بدل جَلوے دکھاتا ہے - مثال کے طور پر علامہ اقبال کے نزدیک اس مادی دور کے اکثر نظریات کی اساس مادہ پرستانہ نقطۂ نظر ہے - منطقی اثباتیت ، مادی جدلیت ، نسلی اور علاقائی قومیت ، سرمایہ داری ، انتفاعِ ناجائز وغیرہ وہ مسائل تھے جن کے باب میں کہی جانے والی مادہ پرستانہ باتوں سے علامہ اقبال کو شدید اختلاف تھا ، اس لیے کہ اُن کے نزدیک آدمی محض ایک مادی وجود نہ تھا ، اسے وجدان کی دولت بھی میسر تھی ، اسے روحانی امکانات سے بھی نوازا گیا تھا ، اور جس طرح مادی امکانات حقیقت ہیں اسی طرح روحانی امکانات بھی حقیقت ہیں - یہ الگ بات ہے کہ آدم نے اغماض برتا اور اعراض اختیار کیا ، نتیجہ یہ نکلا کہ روح دب گئی اور مادیت حاوی ہو گئی -

وہ قوم کہ فیضانِ سماوی سے ہو محروم
حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات ![1]

مادیت کے تسلط نے آدمی کی آدمیت کو بیدار کرنے کے بجائے اُسے حیوانی اور مشینی درجے پر پہنچا دیا ہے اور اس فیصلے کی تائید میں نظریے اور منطق وضع کر لی - یہ غلط نظریے جن کو قبولِ عام کی سی حیثیت حاصل ہو گئی ہے توڑ دیے جانے چاہئیں مگر تقلیدی خطوط پر ان کی تعلیم دی جاتی ہے اور جن اندھے راستوں پر چلایا جاتا ہے ان کی صحیح شناخت کے لیے کسی ایسے صاحبِ ایمان مفکر کی ضرورت ہے جس کو اللہ نے حضرت ابراہیمؑ کی سی نظر دی ہو اور جو باطل کو حق سے جدا کر کے دیکھ سکتا ہو اور پھر جرأت کے ساتھ غلط کو غلط کہہ سکتا ہو ، یعنی باطل نظریات کے بتوں کو پاش پاش کر سکتا ہو - علامہ اقبال اس مضمون کو شعر

۱- بال جبریل ، ص ۱۰۸/۳۰۰ -

میں یوں بیان کرتے ہیں ۔

یہ دور اپنے ابراہیمؑ کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں ، لا الٰہ الا اللہ[1]

ظاہر ہے کہ آدم کش نظریات کا علاج آدم ساز نظریات ہیں ۔ آدمی کو بہتر آدمی بنانے کی نسبت غور و فکر کرنا ہر آدم دوست کا فرض ہے ۔ اس باب میں جو شے سب سے بڑھ کر ممد ہو سکتی ہے وہ ایسا علم ہے جو محض عقلی اور دماغی سرمایہ نہ ہو بلکہ دل میں راسخ ہو اور نظر افروزی کا حق ادا کرے تا کہ بصارت بصیرت بن جائے ۔

سیدھی سی بات ہے کہ علم جو محض دماغی و عقلی سرمایہ ہے وہ شخصیت کی تعمیر میں حصہ دار نہیں ہو سکتا ، اس لیے کہ شخصیت میں انقلاب یقین کے باعث پیدا ہوتا ہے ۔ کسی اعلیٰ اصول پر یقین جس قدر محکم ہوگا اسی قدر اس کا اثر کردار پر زیادہ پڑے گا ۔

یقیں مثل خلیل آتش نشینی ! یقیں اللہ مستی ، خود گزینی !
سن اے تہذیب حاضر کے گرفتار غلامی سے بتر ہے بے یقینی ![2]

بڑا آدمی ہونا اور بات ہے اور اچھا آدمی ہونا اور بات ہے ۔ عقلی اور نظری سطح پر ہی رہ جانے والا بسا اوقات اُلٹا مزید انسانیت کش ثابت ہوتا ہے ، اور ان معنوں میں نا تربیت یافتہ منہ زور جبلتیں اپنی وحشت کے نفاذ کے لیے علم و آگاہی کو اوزار اور ہتھیار بنا لیتی ہیں ۔ بد نیت اور بے امانت آدمی علم کی وجاہت کے سہارے زیادہ نقصان دہ ثابت ہوتا ہے ۔ وہ زیادہ خطرناک دلیلیں اختراع کر سکتا ہے اور زیادہ خطرناک منطق وضع کر سکتا ہے کیونکہ علم تو ایک

۱- ضرب کلیم ، ص ۱۵/۴۷۷ -
۲- بال جبریل ، ص ۸۱/۳۷۳ -

غیر جانب دار قوت ہے ۔ اگر اس قوت کا استعمال کرنے والا فرد اچھا انسان ہے تو وہ قوت مفید ثابت ہو سکتی ہے اور اگر قوت کا استعمال کرنے والا برا ہے تو وہ قوت مضرت رساں ثابت ہو سکتی ہے مگر راہ ہدایت پر چلنے والا شخص جانتا ہے کہ غلط کیا ہے اور صحیح کیا ہے ۔ وہ صحیح کو قبول کرتا ہے اور غلط کو بڑی جرأت کے ساتھ رد کردیتا ہے ۔ علامہ اقبال نے اپنی بات کو ابراہیمی حوالے سے ان الفاظ میں سمجھایا ہے ۔

وہ علم اپنے بتوں کا ہے آپ ابراہیم[۴]
کیا ہے جس کو خدا نے دل و نظر کا ندیم[۱]

علامہ اقبال نئے علوم کے محض اس لیے مخالف نہ تھے کہ وہ نئے ہیں بلکہ ان علوم کی مادی بنیاد و اساس اور مادی تعلیم و تاثیر کے مخالف تھے جس سے ضمیرِ آدم مسخ ہو رہا تھا ، ورنہ وہ تو ہر لحظہ جدت و ندرت کے طلبگار رہے ۔ ان کی گھبراہٹ اور ان کا اضطراب زوالِ آدم کا اندیشہ تھا اور وہ اندیشہ روز بروز صحیح ثابت ہوتا جا رہا تھا ، ورنہ شوق و جستجو کی راہوں پر وہ کسی منزل کو آخری منزل قبول کرنے پر تیار نہ تھے ۔

تو رہ نوردِ شوق ہے ؟ منزل نہ کر قبول !
لیلیٰ بھی ہمنشیں ہو تو محمل نہ کر قبول ![۲]

ہر لحظہ نیا طور ، نئی برقِ تجلی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے[۳]

علامہ اقبال خود اپنے لیکچروں کے بالکل آغاز میں فرماتے ہیں ”جوں جوں علم کو ترقی ہوگی اور فکر کی نئی راہیں کھلیں گی کئی

۱۔ ضرب کلیم ، ص ۳۸۸/۲۶ ۔
۲۔ ایضاً ، ص ۵۳۴/۲۲ ۔
۳۔ ایضاً ، ص ۵۸۹/۱۲۷ ۔

دیگر نقطہ ہائے نظر، جو گمان یہ ہے کہ ان لیکچروں میں بیان کردہ نقطہ ہائے نظر سے صحیح تر ہوں گے، ظہور میں آئیں گے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم احتیاط کے ساتھ اولادِ آدم کی فکری ترقی پر نظر رکھیں اور اس کے بارے میں ایک آزاد اور غیر جانب دار تنقیدی انداز اختیار کیے رکھیں۔" ظاہر ہے کہ وہ نئے افکار کے طلب گار تھے مگر اس شرط کے ساتھ کہ آنکھیں کھلی رہیں، احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے اور خود مختار تنقیدی انداز بحال رہے تاکہ اندھا دھند غلط بات قبول یا رد کرنا ممکن نہ رہے۔ کوئی نئی بات محض اس لیے غلط یا صحیح نہیں کہ وہ نئی ہے اور نہ کوئی پرانی بات محض اس لیے غلط یا صحیح ہے کہ وہ پرانی ہے۔ علامہ اقبال تو دورانِ زمان کو ایک مسلسل اور متصل رو جانتے ہیں۔ یہ ماہ و سال کی تقسیم ہماری حسابی ضرورت ہے ورنہ زمانِ بسیط ناقابلِ تقسیم ہے، اس میں ماضی و حال نہیں پایا جاتا۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں۔

زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک
دلیل کم نظری قصہ جدید و قدیم[1]

لہٰذا صداقت صداقت ہے، نئی صداقت اور پرانی صداقت جیسی کوئی شے نہیں پائی جاتی، اس لیے نظامِ کائنات جو لاکھوں برس سے ہے، اس میں اشیاء کی تدریجی ترقی جاری ہے۔ مگر بنیادی عناصر کائنات کے اساسی خواص میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ پانی جو آج اتنے درجہ فارن ہیٹ پر پہنچ کر بخارات میں تبدیل ہوتا ہے، آج سے ایک لاکھ سال قبل اس سے اتنے درجے کم یا زیادہ پر بخارات میں تبدیل ہوتا تھا۔ یا ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ آج جو مائعات اپنی سطح ہموار رکھتی ہیں آج سے پانچ لاکھ سال قبل وہ اس اصول کی پابند نہ تھیں۔ درحقیقت یہ خواص

۱۔ ضربِ کلیم، ص ۳۸۸/۲۶۔

اشیاء کا ثبات و استقلال ہے جس پر اصول تحقیق وضع ہوئے اور آستوار رہے ۔ لہٰذا ہمارا فلسفہ اور ہماری سائنس قدیم اور غیر متغیر خواص اشیاء پر مبنی ہونے کے باعث نئی دریافت کا دعویٰ تو کرسکتی ہے مگر بدیع (Original) ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتی ۔ خواص کی دریافت بہرحال دریافت ہی ہے ، تخلیق نہیں ۔ خواص کی باہم آمیزش سے نئی صورتوں کی تشکیل کو کسی حد تک اختراع قرار دیا جا سکتا ہے مگر اسے بھی تخلیقِ جدید نہیں بتایا جا سکتا ۔ بہرحال ان قدیم صداقتوں کی دریافت اور ان پر مبنی اصول وضع کرنے کے لیے ایک کلیت بین اور جامعیت پسند (Comprehensivist) نظر کی ضرورت ہے ، اس نظر کی ضرورت ہے جو کہے ۔

حقیقت ایک ہے ہر شے کی خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں[1]

علامہ اقبال کو دکھ اس بات کا تھا کہ وہ علوم جو تدریجی علمی ترقی کا نتیجہ تھے ، اُن لوگوں کے ہتھے چڑھ گئے جن کے بدن زندہ روح سے خالی تھے ، جن پر جوہری (Automistic) رویہ حاوی تھا ، جنہوں نے آدم کو بھی ذرات کا ایک مجموعہ سمجھا اور بس ۔ لہٰذا ان کی نظر بلند نہ ہوسکی ، علمی اُڑان بلند ہو گئی مگر فطرت خاک باز ہی رہی ، عظمت آدم ان کے نزدیک کوئی تصور یا قدر نہ بن سکی ۔ لہٰذا جس طرح ذرات کے ایک مجموعے کا نام انسان ہوگیا ۔ انہوں نے فرد کو بھی اسی نظر سے دیکھا اور اجتماع (Society) کو بھی ایسے عالم میں کہ جہاں روح محض نتیجہ ہو بعض بنیادی خواص کے تناسب و تناسق کا ، وہاں خدا کا یا رُوحِ کل کا کیا تصور ۔ پھر خدا کی حاکمیت اور آدم کی نیابت کا کیا معنیٰ ، نور اور وحی و ہدایت کا کیا مفہوم ، الخلق عیال اللہ (تمام مخلوق اللہ کا کنبہ ہے) کا کیا مقصود ! — نتیجہ یہ ہوا کہ وہ علوم جن کو نئے علوم کا

۱۔ بانگ درا ، ص ۲۷۱/۲۷۱ ۔

نام دیا جاتا ہے ، بڑی شاندار دریافتوں اور آن دریافتوں پر مبنی شاندار ایجادوں اور اختراعوں پر قادر ہو جانے کے باوصف ”آدمیت احترام آدمی“ کی قدر (Value) دریافت نہ کر سکے - چنانچہ آدمی محض ایک متحرک مادی وجود بن کر رہ گیا ، جو اپنی مادی ضروریات یا بالفاظ دیگر اپنے وجود حیوانی کے مطالبات کے جذب و انجذاب کی تسکین کر رہا ہے -

یورپ از شمشیرِ خود بسمل فتاد　　زیر گردوں رسمِ لادینی نہاد
در نگاہش آدمی آب و گل است　　کاروانِ زندگی بے منزل است[1]

اگر وہ اپنے دور کے اسلوبِ دانش سے بیزار تھے تو اس کا باعث یہی تھا - وہ دیکھ رہے تھے کہ کلیت اور جامعیت کو نگاہ میں رکھ کر نظام و اصول وضع کرنے والے محقق مغرب کی عیاش اور مادہ پرست سوسائٹی سے نمودار نہیں ہو رہے ، جس کا حتمی نتیجہ یہ ہوگا کہ انسانی معاشرہ خود اپنی ہی نو دریافت علمی بلاؤں کے ہاتھوں تہ و بالا ہوجائے گا - اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے بچوں کے ہاتھ بارود لگ گئی ہو - وہ ناسمجھی میں دوسروں کو بھی بھسم کر سکتے ہیں اور اپنے آپ کو بھی -

وہ فکرِ گستاخ جس نے عریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو
اسی کی بے تاب بجلیوں سے خطر میں ہے اس کا آشیانہ ![2]

علامہ اقبال پیچ و تاب کھا رہے تھے ، اس لیے کہ ان کی نگہ حقائق پر تھی اور ان کی توجہ کا رُخ ایک ہی تھا اور وہ یہ تھا کہ خالق کے بتائے ہوئے اصول و قواعد کا پابند رکھ کے آدم کو علم و تحقیق کا ہتھیار مہیا کیا جائے تاکہ آدم بحیثیت آدم بلند و بالا ہو اور اس کا شعورِ آدمیت ، آدم کو ہر لحظہ کے خوفِ بربادی

۱- پس چہ باید کرد ، ص ۸۳۹/۴۳ -
۲- بال جبریل ، ص ۴۲۲/۱۳۰ -

سے اور بے یقینی کی پیدا کردہ سراسیمگی سے نجات دلائے۔ اور یہ امر خدائے واحد پر بھرپور ایمان اور عمل و جزا کی انفرادی ذمہ داری کے یقین کے بغیر ممکن نہیں۔ اور عالم یہ ہے کہ اس طرح سوچنے والے کو موردِ ہزار طعن بنایا جاتا ہے۔ اسی کرب و درد کو علامہ نے ابراہیمی نسبت سے یوں بیان کیا ہے۔

عذاب دانش حاضر سے باخبر ہوں میں
کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثلِ خلیل !!

حضرت ابراہیم کے اس ذکر پر کہ اے بیٹا میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ تجھے ذبح کر رہا ہوں، بتا تو سہی تیری کیا رائے ہے۔ بیٹے نے فوراً عرض کیا، ابا جان اپنے خواب کی عملاً تصدیق فرمائیں۔ مجھے انشا اللہ ثابت قدم پائیں گے، اور یہ کہہ کر اپنی گردن اپنے والد بزرگوار کی چھری کے سامنے خم کر دی۔ اس صورتِ واقعہ سے علامہ اقبال کی نگاہِ دور رس اس نتیجے پر پہنچی کہ کسی شخصیت کی روشن مثال اپنی زیر نگرانی جو تربیت کرتی ہے وہ کتابوں کے کلمات سے نہیں ہو سکتی۔ کتابوں میں بیان کردہ کوائف بہرحال معلومات و اطلاعات کے شعبے سے تعلق رکھتے ہیں مگر ان کوائف کو قلب و نظر پر وارد کر کے انہیں لائحۂ عمل بنانے والے لوگ دوسروں کے لیے روشن مثال بنتے اور حوصلہ افزائی کا باعث ہوتے ہیں۔ پیغمبروں کا معاملہ جدا ہے، ان کی تربیت کا سامان خود خالقِ کائنات کرتا ہے۔ لہٰذا وہ کسی انسانی روشن مثال کے محتاج نہیں ہوتے۔ اس سے لازم آتا ہے کہ عزیزوں کو ناپسندیدہ سے باز رکھنے والے اور پسندیدہ کی جانب رغبت دلانے والے اصحاب خود اپنے کردار کا جائزہ لیتے رہیں۔ ایک باپ، ایک استاد، ایک خطیب، ایک افسر، ایک بالادست عہدیدار، ایک سیاسی رہنما، ایک دینی مبلغ، غرض ہر وہ شخص جسے دوسروں سے کام لینا ہے یا دوسروں

۱- بالِ جبریل، ص ۶۳/۳۵۵ -

کی اصلاح و تربیت کرنا ہے یا ان کی سیاسی رہبری کرنا ہے، اسے جائزہ لیتے رہنا چاہیے کہ اس کی ذاتی مثال کیسی ہے ؟ ایک بے راہ رو باپ، ایک بے ضمیر اُستاد، ایک بے دیانت راہنما، ایک دروغ باف خطیب، ایک بُزدل قائد، ایک ناکارہ اور نا اہل حاکم بالادست کی ترغیب، تلقین اور فرمائش کوئی معنٰی نہیں رکھتی۔ اعلٰی مثال اعلٰی بناتی ہے، ایمان کا عملی نمونہ ایمان عطا کرتا ہے، قربانی کا عملی اقدام قربانی کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ اگر خود ابراہیمؑ اپنی جان کی قربانی نمرود کی آگ میں کود کر پیش نہ کر چکے ہوتے تو شاید ان کے فرزند بھی اس حوصلے کے مالک نہ ہوتے۔ چنانچہ علامہ اقبال کی دقیقہ رس فکر نے اس وسیع مضمون کو فیضانِ نظر کی اجمالی ترکیب میں بیان کر دیا ہے:

یہ فیضان نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسمٰعیل کو آدابِ فرزندی ؟[1]

۱- بالِ جبریل، ص ۳۰۶/۱۴۔

فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا
ترے وجود کے مرکز سے دور رہتا ہے

علامہ اقبال اور حیات بعد الموت

موت وہ پیدائشی حق ہے جس سے آدمی سمیت کوئی متنفس محروم نہیں رہتا ۔ موت کے لیے کسی عمر کا تعین نہیں ۔ یہ نہیں کہ جب تک تقویمی عمر اتنی یا اتنی نہ ہو جائے موت نہیں آتی ۔ بقول کسے آدمی پیدا ہوتے ہی موت کی نظروں میں خاصہ معمر ہو چکا ہوتا ہے ۔ چنانچہ بعض افراد دنیا میں تشریف لاتے ہی اپنا حق موت وصول کر لیتے ہیں ۔ بعض کو انتظار کرنا پڑتا ہے مگر بہرحال" موت "بن آئے نہ رہے"۔ حق یہ ہے کہ عموماً ہر فرد بشر زندہ رہنا چاہتا ہے ۔ وہ شعور حیات اور احساس بقا کی لذت سے محروم ہونا پسند نہیں کرتا ۔ اگر کبھی اس کے برعکس کوشش کرتا ہے تو اس وقت جب زندگی اس کی نظر میں اپنی وقعت کھو بیٹھتی ہے ، یہی نہیں بلکہ اذیت کا جہنم بن جاتی ہے اور وہ اس جہنم سے بھاگ کھڑا ہوتا ہے ۔ یا ایسی کوشش اس وقت عمل میں آتی ہے جب وہ جانتا ہے کہ کوئی ایسا مقصد جو بڑا بلند اور مقدس ہے جان کی قربانی کا طلب گار ہے ۔ لہٰذا وہ ایمان و یقین کی لذت سے سرشار جان دے دیتا ہے ۔ ایک صورت خودکشی کی ہے ، دوسری شہادت کی ۔ دنیا میں اس وقت انسانی نفری تین ارب کے قریب ہوگی ۔ اس تناسب سے خودکشی خال خال ہے ۔ شہادت اس سے بھی کمتر ، ہزاروں لاکھوں میں ایک ، باقی سب طبعی موت مرتے ہیں ۔

حیوان بھی موت کا منظر دیکھتا ہے یعنی جب اپنی جان کو خطرے میں پاتا ہے تو سکڑتا ہے ، لرزتا ہے ، چیختا ہے مگر خدا جانے جانور موت کے بارے میں بعالمِ عافیت اس طرح بار بار

سوچتا بھی ہے یا نہیں جس طرح آدمی سوچتا ہے ۔ شاید ہی کوئی آدمی ہو جسے دن میں چند بار موت کا خیال نہ آتا ہو ۔ کبھی یہ خیال زندگی کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ دلاتا ہے یعنی جو جو معرکے مارنا ہیں مار لو ، جو جو میلے منانا ہیں منا لو ، کیا پتہ مہلتِ حیات کب ختم ہو جائے ۔ بقولِ غالب

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا　　نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا !

کبھی یہ خیال ہمت شکن عبرت عطا کرتا ہے ، کہ اگر منزلِ آخر فنا ہی ہے تو پھر کاوش و کاہش کیوں ، تعمیرات کا کیا معنٰی ، فتوحات کا کیا مطلب ، جاہ و حشمت اور مال و دولت کس لیے ؟

نسب نامۂ خسرو کیقباد　　ورق تا ورق چار سو برد باد

کبھی یہی خیال آدمی کو آدمی بنے رہنے یا اگر وہ خدا بن بیٹھا ہو تو دوبارہ آدمی بن جانے کی تلقین کرتا ہے ، اگر موت کے خیال کی لگام نہ ہو تو نہ جانے یہ اپنی وحشی جبلتوں کی تسکین کے لیے کیا کیا کچھ کر گزرے اور پھر غرور و تحکم میں مبتلا ہو کر نہ جانے اپنے بارے میں کیا کیا کچھ گمان کرنے لگے ۔

بقولِ ذوق

موت نے کر دیا مجبور وگرنہ انساں
ہے وہ خود بیں کہ خدا کا بھی نہ قائل ہوتا

بہرحال مشاہدہ یہی ہے کہ عموماً ہر فرد بشر موت سے پہلو بچاتا ہے اور زندگی کو موت پر ترجیح دیتا ہے ۔ مٹ جانے کا تصور اسے قبول نہیں اور وہ اس امر کا تو کسی نہ کسی طرح سے طلب گار رہتا ہے کہ اگر دنیا میں وہ خود زیادہ دیر تک نہ جی سکے تو کم از کم اس کی نشانیاں رہ جائیں ۔ اور کچھ نہیں تو اولاد ہی سہی ۔ بعض افراد تو ایسے کارِ نمایاں سر انجام دے جانا چاہتے ہیں جس کے

باعث آن کا نام تا دیر زندہ رہے — وہ کار نمایاں سیاسی میدان میں بھی انجام دیا جا سکتا ہے ، دینی میدان میں بھی ، علمی اور فنی میدان میں بھی ، محبت کے میدان میں بھی اور جنگ کے میدان میں بھی -

بہت سے بلکہ عموماً سارے قدیم انسانی معاشرے حیات بعد الموت کے قائل ہیں ، خاص طور پر وہ معاشرے جو کسی نہ کسی الہامی دین پر استوار ہیں اور خدا کے واضح یا غیر واضح تصور سے بہرہ مند ہیں - خدا کے ماننے والوں اور حیات بعد الموت پر اعتقاد رکھنے والوں کے لیے زندگی ایسا بھیانک بوجھ نہیں بنتی جیسا تصور خدا سے محروم معاشروں کے افراد کے لیے ہے - حیات بعد الموت کا تصور پختہ ہو کر یقین کی صورت اختیار کر لے تو راہ زندگی اور منزل موت دونوں آسان ہو جاتی ہیں - اس کے مقابل ہلاک اور فنا ہو جانا اور نابود و ناپید ہو کر رہ جانا وہ تصور ہے جو زندگی کو مہمل بنا کر رکھ دیتا ہے اور آج کے مادہ پرست معاشرے اسی اذیت کا شکار ہیں - وہ لوگ تو قرآن کریم کے بیان کے مطابق فقط یہی کچھ جانتے ہیں کہ انہیں زمان بسیط مٹا کر رکھ دیتا ہے 'وما یهلکنا الا الدھر' — اور اگر عقیدہ یہ ہو کہ

موت اک ماندگی کا وقفہ ہے   یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

تو پھر تا دم آخر زندگی کو بھرپور زندگی بنائے رکھنے کا جذبہ باقی رہتا ہے - قدیم مصری اس ضمن میں باقی سب اقوام سے آگے تھے - J. H. Breasted نے اپنی کتاب "Development of Religion and Thought in Ancient Egypt" میں اسی امر پر زور دیا ہے اور لکھا ہے کہ پرانے معاشروں میں کوئی اور معاشرہ حیات ورائے قبر کو اتنی اہمیت نہیں دیتا جتنی قدیم مصری دیتے تھے -[1]

۱- عربی ترجمہ کتاب مذکور ، تطور الفکر والدین فی مصر القدیمۃ ، دارالکرنک ، القاہرہ (۱۹۶۱ء) ص ۸۵ -

اس کتاب کا دوسرا باب جو حیات بعد الموت اور قبر میں عارضی اقامت سے تعلق رکھتا ہے بڑا دلچسپ ہے۔ بریسٹڈ نے پرانے گورستانوں میں اپنی تحقیق کے دوران میں جو جو کچھ دیکھا اسے مزے لے لے کر بیان کیا ہے کہ پانچ ہزار سال پہلے کے حانوط شدہ وجود کس طرح آج بھی تر و تازہ ہیں۔ اہلِ مصر مرنے والے کے ساتھ اس کا قیمتی سامان بھی دفن کر دیتے تھے۔ اس کی پسندیدہ خوراک بھی ایک معقول مقدار میں ساتھ رکھ دی جاتی تھی۔ بعض بادشاہوں کے اہراموں میں تو ان کی پسندیدہ لونڈیاں اور خادم بھی زندہ ہی قید کر دیے جاتے تھے تا کہ بادشاہ کو جاگنے پر احساسِ تنہائی نہ ہو۔ بادشاہ اپنی قبریں اہراموں میں اپنی زندگی ہی میں تعمیر کرا دیتے تھے اور اطمینان کر لیتے تھے کہ ان کے ہمراہ دفن ہونے والا خزانہ دشمنوں کی دست برد سے محفوظ رہے گا۔ نیز یہ کہ کوئی اور بادشاہ اپنی قبر سے آ کر ان پر حملہ بھی نہ کرے گا۔ اس ضمن میں پروفیسر جی۔ ای الیٹ سمتھ کی کتاب "The History of Mummification in Egypt" کا مطالعہ بھی ضروری ہے جسے رائل فلاسوفیکل سوسائٹی گلاسگو نے ۱۹۱۰ء میں شائع کیا تھا۔

ہندو اپنے مردوں کو جلا دیتے ہیں۔ وہ روح کو کسی خاص جسم کا محتاج نہیں جانتے۔ چنانچہ وہ مردوں کو دفن نہیں کرتے۔ وہ جلائے جانے والے جسم کی حیاتِ ثانیہ کے قائل نہیں۔ ہاں وہ روح کو دائمی جوہر جانتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ جو روح دنیوی آلائشوں اور گناہوں کے داغوں کی بدولت ناپاک ہوتی ہے اس کے روبرو آسمان کے در بند ہو جاتے ہیں اور وہ جملہ آلائشیں دھل جانے تک آسمان سے نیچے ہی رہتی ہے۔ بدھ مت نے اس تصور کو اس کی منطقی غایت تک پہنچا دیا، یعنی روح اگر زیرِ آسمان رہتی ہے اور اپنے آپ کو آلائشوں سے پاک کرنے میں مصروف رہتی ہے تو یہ کسی جسم کے ساتھ وابستہ ہوئے بغیر ممکن نہیں۔ اعمال کا ازالہ اعمال ہی کریں گے اور بے جسم کوئی روح کیا ازالۂ اعمال

کر سکتی ہے - چنانچہ تناسخ کے تصور نے راہ پائی - چھٹی صدی قبل مسیح سے قبل عام ہندو تناسخ کے قائل نہ تھے ، ہاں یہ تصور بعض سادھو سنگتوں میں ضرور مروج تھا - مگر بدھ مت کے زیر اثر رفتہ رفتہ ہندو قوم نے اسے قبول کر لیا - چنانچہ بدھ مت کے بھارت میں تقریباً ختم ہوجانے کے باوصف مابعد کے فلاسفہ مثلاً شنکر اچاریہ اور رامانوج ''سنسار چکرم'' کے بدستور قائل رہے - اس ضمن میں ڈاکٹر رادھا کرشنن کی کتاب ''The Vedanta'' اور ''Indian Philosophy'' شائع کردہ ''George Allen and Unwin London'' دیکھ لینی چاہیے - انسائیکلوپیڈیا بریٹینیکا میں شامل مقالہ Hinduism بھی مجملاً یہی بتاتا ہے کہ ہندوؤں میں تناسخ کا رواج پانا بدھ مت کے اثرات کا نتیجہ ہے -

رہا اسلام تو اس کے اساسی عقائد میں یہ عقیدہ شامل ہے کہ حیات بعد الموت برحق ہے اور ہر فرد کو ایک دن اللہ کے حضور میں اپنے اعمال کی جواب دہی کے لیے حاضر ہونا ہے اور پھر اسے سزا اور جزا پا کر اگلے جہان میں دائمی حیات سے ہمکنار ہونا ہے - مطلب یہ کہ آدمی فنا نہیں ہوتا -

تاہم کوئی بھی موت کی منزل سے گزر کر واپس نہیں آیا - خوابوں میں بڑوں نے بھی اور چھوٹوں نے بھی اپنے احوال بارہا بیان کیے ، خوابوں میں آ کر مرنے والوں نے عزیزوں کو بارہا بعض رونما ہونے والے حادثات سے آگاہ کیا اور اپنی بے آرامی کے ازالے کا مطالبہ کیا - بارہا یوں بھی ہوا کہ کئی کئی سو سال پہلے کے وفات یافتہ کسی شخص نے دوبارہ انسانی شکل میں کسی سے ملاقات کی ، کوئی بات بتائی ، اور پھر غائب ہو گیا - ان امور سے متعلق اولیاء و صوفیہ کے تذکرے گونا گوں کہانیاں سناتے ہیں - دور نہ جائیے ، اس ضمن میں فقط امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کی ''کتاب الروح'' دیکھ لیجیے ، خصوصاً اس کتاب کا دوسرا اور

تیسرا باب ۔ اس اعتبار سے حال ہی میں لاہور سے شائع ہونے والی کتاب ''موت کے بعد'' مصنفہ ایم اسلم بھی لائق توجہ ہے ۔ میاں اسلم صاحب نے یوروپی ، امریکی اور بھارتی ماہرین نفسیات اور فلاسفہ کے مشاہدات سے بھی بڑی مدد لی ہے اور بتایا ہے کہ اس موضوع کو سائنسی سطح پر اہل فلسفہ و نفسیات کس طرح اپنی دقت نظر اور تجربات کا ہدف بنا رہے ہیں اور کس طرح بقائے روح کے قائل ہوتے جا رہے ہیں ۔ دارالمعارف مصر کی شائع کردہ کتاب ''بین عالمین'' بھی مختصر ہونے کے باوصف دلچسپ تصنیف ہے ۔ اس کتاب کے مصنف مصطفٰی الکیک ہیں ۔ یہ ۱۹۶۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ Desmond Shaw کی کتابیں ''How You Live When You Die'' اور ''You Can Speak with Your Dead'' یقیناً دلچسپ معلومات و تجربات سے مایہ دار ہوں گی جیسا کہ ناموں سے ظاہر ہے ۔ یہ نظر سے نہیں گزریں ، فقط ''بین عالمین'' میں مجمل سے اقتباس دیکھے ہیں ۔ بہرحال پیراسائیکلوجی کے نام سے ''عالم ارواح'' بھی سائنس کی زد میں آ رہا ہے ۔ اللہم زد فزد ۔ سی ۔ ڈی براڈ نے اپنی مشہور و معروف کتاب The Mind and Its Place in Nature کے گیارھویں اور بارھویں باب میں بقائے روح پر بڑی دقیق بحث کی ہے ۔ منطق کا بوجھ زیادہ نہ ہوتا تو باتیں دلآویز تھیں ۔ ان کا تجزیاتی رحجان تو بقائے روح کے انکار پر مصر نہیں البتہ وہ اسے سائنسی دلیل کے ذریعے ماننا چاہتے ہیں ۔ چنانچہ وہ اس کتاب کے سیکشن ''ڈی'' کے تعارفی کلمات کو الفاظ ذیل پر ختم کرتے ہیں :

I may say at once, that my own view is that, if human survival can be rendered probable at all this can be done only by empirical arguments based on the phenomena which are treated by psychical research.

علامہ اقبال تو ویسے ہی شاعر حیات اور فیلسوف بقا ہیں ۔ انہوں نے اپنے شعروں میں بھی تصور بقا کی تائید کی ہے اور

فلسفانہ مباحث میں بھی۔ آدمی کے غیر فنا پذیر ہونے کا مضمون اُن کی ابتدائی نظموں سے لے کر آخری کلام تک روحِ زندہ کی طرح جاری و ساری ہے، البتہ یہ خلش کہ اگلا جہان کیسا ہوگا، باقی رہتی ہے۔ وہاں کی زندگی یہاں کی زندگی سے کس کس معنٰی میں مختلف ہے؟ یہ احساس اپنی جگہ بجا کہ میں زندہ رہوں گا، مگر کس رنگ میں؟ وہاں میری انفرادی ہستی کی حیثیت کیا ہوگی؟ آیا وہاں بھی معاشرے ہوں گے، رشتہ داریوں کے دھندے بھی ہوں گے، آیا وہاں بھی لوگ عشق فرمائیں گے، وہاں بھی روزی کمانے کے لیے کچھ کرنا پڑے گا، کیا وہاں بھی چوروں اور اچکوں سے واسطہ رہے گا؟ آیا کوئی کھیل تماشے کی صورت بھی ہوگی۔ الغرض جی چاہتا ہے کہ پتہ چلے آیا یہاں کا سا نقشہ وہاں بھی جمے گا؟ بانگِ درا کے حصہ اول میں شامل ایک نظم ''خفتگانِ خاک سے استفسار'' انہی مضامین کی ترجمان ہے اور یہی خلش مختلف سوالات کی صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ حق یہ ہے کہ علامہ نے مابعد الطبعیات کو شعر کے حسین پیکر میں سجا کر سامنے لا بٹھایا ہے۔

آدمی واں بھی حصارِ غم میں ہے محصور کیا؟
اس ولایت میں بھی ہے انسان کا دل مجبور کیا؟

رشتہ و پیوند یاں کے، جان کا آزار ہیں
اس گلستاں میں بھی کیا ایسے نکیلے خار ہیں؟

اس جہاں میں اک معیشت اور سو افتاد ہے
روح کیا اس دیس میں اس فکر سے آزاد ہے؟

کیا وہاں بجلی بھی ہے، دہقان بھی ہے، خرمن بھی ہے؟
قافلے والے بھی ہیں؟ اندیشۂ رہزن بھی ہے؟

باغ ہے فردوس یا اک منزلِ آرام ہے؟
یا رخِ بے پردۂ حسنِ ازل کا نام ہے؟

کیا جہنم معصیت سوزی کی اک ترکیب ہے؟
آگ کے شعلوں میں پنہاں مقصدِ تادیب ہے؟

جستجو میں ہے وہاں بھی روح کو آرام کیا؟
واں بھی انساں ہے قتیلِ ذوقِ استفہام کیا؟

تم بتا دو راز جو اس گنبدِ گرداں میں ہے
موت اک چبھتا ہوا کانٹا دلِ انساں میں ہے[1]

موت کے بعد کیا ہوگا کا خیال ایک مستقل خلش ہے، چبھتا ہوا کانٹا۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ سارے سوال جس نظریے پر مبنی ہیں اور جس تصور یا عقیدے کی طرف دلالت کرتے ہیں وہ حیات بعد الموت ہے۔ اگر یہ پتہ ہو کہ مرے اور مٹے، نابود ہوئے، تو پھر یہ سوالات پیدا ہی نہ ہوں وغیرہ سب عوامل، حیات کے تسلسل کو تسلیم کرنے کا شاخسانہ ہیں۔

افلاطون نے اس خلش کو بھی اپنے ''مکالمات'' میں حسبِ معمول بزبانِ سقراط بارہا بیان کیا ہے۔ مثلاً دفاع (Apology) میں ہے کہ موت کی دو صورتیں ہیں۔ یہ کہ آدمی نیست ہو کر رہ جائے، اسے نہ شعور میسر رہے نہ حس، یا جیسے خیال کیا جاتا ہے کہ روح یہاں سے دوسری جگہ منتقل ہو جاتی ہے۔ پہلی صورت گہری اور عمیق نیند کی سی کوئی حالت ہے جس میں خواب کا بھی کوئی دخل نہ ہو۔ وہ نیند کتنی راحت بخش ہوتی ہے۔ یہ گہری ابدی نیند ایک رات سے کچھ بھی بیش نہیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ روح فردوس (Hades) میں منتقل ہو جاتی ہے۔ اگر سچ مچ ایسا ہو تو خوب رہے، وہاں اصلی ججوں سے ملاقات ہوگی۔ وہ جج یہاں کے ججوں کی طرح نہیں جو جج بنے تو پھرتے ہیں مگر حقیقتاً نہیں۔ وہاں بڑے بڑے مصنفین سے بھی باتیں ہوں گی۔ ہومر اور

۱- بانگِ درا، ص ۴۰، ۳۹/۴۰، ۳۹۔

ہیسیڈ سے ملاقاتیں ہوں گی اور اوڈیس اور سسی فس سے تبادلۂ خیال ہو گا۔ کسی سے ٹرائے کی سہات کی روداد سنی جائے گی اور کسی سے اور کچھ ، پھر خوب خوب جرح ہوگی۔ اور یہ وہ مسرت ہے جس کے مزے کی کوئی حد ہی نہیں ۔ اور ہاں اس جگہ کوئی کسی کو جرح کرنے کے جرم میں کوئی سزا نہ دے گا' ۔ لیکن یہ کیفیت کہ حیات بعد الموت ہے یا نہیں ، آخر اس یقین میں بدل گئی کہ انسانی روح غیر فانی ہے ۔ مثال کے طور پر وہی مکالمہ دیکھ لیجیے جس کا عنوان ''فیدون'' (Phaedo) ہے ۔

بانگِ درا کے اسی حصہ اول کی ایک چھوٹی سی نظم '' کنارِ راوی'' ہے جو تسلسلِ حیات کے مضمون کی بڑی بلیغ اور دلکش ترجمانی کرتی ہے ۔ پرسکوت شام ، دریا کا کنارا ، ڈوبتے ہوئے سورج کا لرزنا ، دن کے قافلۂ تیزگام کا گزر جانا ، ایک فاصلے پر شہنشاہ جہانگیر کا مقبرہ اور اس کے منار ۔ اس منظر نے شعر ذیل بھی کہلوایا ۔

فسانۂ ستمِ انقلاب ہے یہ محل
کوئی زمانِ سلف کی کتاب ہے یہ محل[۲]

یعنی وہ منظر اور وہ موقع و محل کیا کیا کچھ سمجھا جا رہا تھا ، مگر آپ نے دیکھا یہاں بھی لفظ انقلاب آیا ہے ، ہلاکت اور فنا نہیں آیا ۔ ازاں بعد اچانک مضمون بدلتا ہے اور جو بات مایوسی اور اداسی سے شروع ہوئی تھی پھر امید اور امنگ کا رنگ اختیار کر لیتی ہے ۔

۱- Dialogue of Plato شائع کردہ Mentor Books (1956) صفحہ ۴۴۵ ، ۴۴۶ ۔

۲- بانگِ درا ، ص ۹۵/۹۵ ۔

روان ہے سینۂ دریا پہ اک سفینۂ تیز
ہوا ہے موج سے ملّاح جس کا گرم ستیز
سبک روی میں ہے مثلِ نگاہ یہ کشتی
نکل کے حلقۂ حدِ نظر سے دور گئی
جہازِ زندگیٔ آدمی رواں ہے یونہیں
ابد کے بحر میں پیدا یونہیں نہاں ہے یونہیں
شکست سے یہ کبھی آشنا نہیں ہوتا
نظر سے چھپتا ہے، لیکن فنا نہیں ہوتا[1]

حضرتِ علامہ حیات کے اس تسلسل کو نہرِ رواں سے تشبیہہ دیتے ہیں، اس نہرِ رواں کا سرچشمہ ایک ہے اور وہ ازلی و ابدی ہے، وہ باقی ہے، لازوال ہے، خواہ وہ نہر قطرہ قطرہ ہو کر بکھر جائے مگر قطرے پھر ایک دوسرے سے ملنے کے لیے مضطرب رہتے ہیں - یہی عالم نوعِ انسانی کا ہے، جو ''نفخ رُوح'' --- ایک ہی نفخِ روح کی پیدا کردہ بے شمار صورتیں اور شکلیں ہیں - یہ انسانی وجود روحانی طور پر جتنے ایک دوسرے کے قریب ہوں اتنے ہی زیادہ لذتِ یگانگت محسوس کرتے ہیں اور جب قریب رہنے کے بعد دور ہوں تو فریاد کرنے لگتے ہیں حالانکہ یہ دوری دائمی نہیں ہوتی، پھر مل ہی جانا ہوتا ہے - تاہم جدائی کے احساس سے بیتاب ہونا طبعی اور قدرتی بات ہے - اس مضمون کو حضرتِ علامہ نے ''فلسفۂ غم'' میں بیان کیا ہے جو بانگِ درا کے تیسرے حصے میں شامل ہے - کوئی حرج نہیں اگر چند شعر درج کر دیے جائیں -

آتی ہے ندی جبینِ کوہ سے گاتی ہوئی
آسماں کے طائروں کو نغمہ سکھلاتی ہوئی

۱- بانگِ درا، ص ۹۵/۹۵ -

آئینہ روشن ہے اس کا صورتِ رخسارِ حور
گر کے وادی کی چٹانوں پر یہ ہو جاتا ہے چور
نہر جو تھی اس کے گوہر پیارے پیارے بن گئے
یعنی اس افتاد سے پانی کے تارے بن گئے
جوئے سیمابِ رواں پھٹ کر پریشاں ہو گئی
مضطرب بوندوں کی اک دنیا نمایاں ہو گئی
ہجر ، ان قطروں کو لیکن وصل کی تعلیم ہے
دو قدم پر پھر وہی جو مثلِ تارِ سیم ہے
ایک اصلیت میں ہے نہرِ روانِ زندگی
گر کے رفعت سے ہجومِ نوعِ انساں بن گئی
پستیٔ عالم میں ملنے کو جدا ہوتے ہیں ہم
عارضی فرقت کو دائم جان کر روتے ہیں ہم[1]

''خفتگانِ خاک سے استفسار'' اور ''کنارِ راوی'' بانگِ درا کے حصہ اول سے تعلق رکھتی ہیں - اس حصے میں ۱۹۰۵ء تک کا کلام شامل ہے اور ۱۹۰۵ء تک علامہ ابھی بمشکل تیس برس کے تھے - ''فلسفۂ غم'' بانگ درا کے تیسرے حصے کا جزو ہے جو ۱۹۰۸ء سے ۱۹۲۳ء تک یعنی پندرہ سولہ سال کے عرصے کو محیط ہے - یہ نظم سر فضل حسین کے والد بزرگوار کی وفات پر کہی گئی تھی اور بطورِ تعزیت کہی گئی تھی - مگر علامہ اقبال نے ایک موت کا نہیں بلکہ ہر موت کا تعزیت نامہ تحریر کر دیا ہے - تعزیت کا معنٰی ہے تسلی دینا ،کسی محرومی کے درد کو سہہ جانے کی خاطر تلقینِ حوصلہ کرنا ، دکھ بانٹنا وغیرہ - لہٰذا ہر مرنے والے کو ، جو مرنے والوں کا غم کھاتا ہے سمجھا دیا کہ

۱- بانگِ درا ، ص ۱۵۷،۱۵۶/۱۵۷،۱۵۶ -

مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں
یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جُدا ہوتے نہیں

''کنارِ راوی'' میں بھی یہی کہا گیا تھا

شکست سے یہ کبھی آشنا نہیں ہوتا
نظر سے چھپتا ہے لیکن فنا نہیں ہوتا

بقا پر اُن کا یہ اعتماد اتنا مستحکم ہے کہ کہیں ڈولتا نظر نہیں آتا ۔ کہا جا سکتا ہے کہ ''خفتگانِ خاک سے استفسار'' اور ''کنارِ راوی'' میں اصولی باتیں کہی گئی ہیں اور ''فلسفۂ غم'' میں جو تسلی بخش ، تشفی آموز اور حوصلہ افزا بات کی گئی ہے وہ بھی اصول ہی کے تحت آتی ہے ، اس لیے کہ مرنے والا کسی اور کا باپ تھا ۔ مگر بات یوں نہیں ، علامہ کا بقائے حیات پر یقین اس وقت بھی کمزور نہ ہوا جب خود اُن کی اپنی والدہ ماجدہ فوت ہوئیں ۔ انہوں نے اپنی والدہ کی جدائی کو شدت سے محسوس کیا ۔ ہر اس شخص کی طرح محسوس کیا جو والدہ کے وجود کو سر بسر مامتا تماماً شفقت اور رحمت جانتا ہے اور جو ہر عمر میں والدہ کے حضور میں لاڈ کرنا چاہتا ہے اور تقویمی عمر کی منزلوں سے بے نیاز طفل شیرخوار بن کر رہ جاتا ہے ۔ بہرحال نظم ''والدۂ محترمہ کی یاد میں'' بانگِ درا کے تیسرے حصے کی بڑی اور اہم نظموں میں سے ہے ۔ علامہ نے یہاں بھی درد و کرب اور احساسِ جدائی کو کہ فطرتِ انسانی کا خاصہ ہے آخرکار اُمید و آرزو میں بدل دیا ہے اور ایک اصولِ باز پیدائی کے تحت یہ واضح کر دیا ہے کہ یہ انسان کے وجود کا اندرونی تقاضا ہے کہ وہ زمین سے دوبارہ برآمد ہو ، وہ زیادہ دیر تک دبا نہیں رہ سکتا ۔ مٹ جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔

یہ خود ذاتِ انسانی کی اندرونی قوتِ نمو ہے جو بیج کی طرح پھوٹ نکلتی ہے - زمین اس کو دبا کے اور روک کے رکھ ہی نہیں سکتی - آدمی کی باز پیدائی کا تقاضا اٹل ہے ، وہ عمل میں آ کے رہتا ہے - علامہ فرماتے ہیں :

تخمِ گل کی آنکھ زیرِ خاک بھی بے خواب ہے
کس قدر نشو و نما کے واسطے بیتاب ہے
زندگی کا شعلہ اس دانے میں جو مستور ہے
خود نمائی خود فزائی کے لیے مجبور ہے
سردیٔ مرقد سے بھی افسردہ ہو سکتا نہیں
خاک میں دب کر بھی اپنا سوز کھو سکتا نہیں
پھول بن کر اپنی تربت سے نکل آتا ہے یہ
موت سے گویا قبائے زندگی پاتا ہے یہ
موت ہے اس قوتِ آشفتہ کی شیرازہ بند
ڈالتی ہے گردنِ گردوں میں جو اپنی کمند
موت تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے
خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے[1]

اس موضوع کو ہم نے جہاں فلسفیانہ نظم میں سوزِ دل کا ترجمان پایا وہاں یہی موضوع فلسفیانہ نثر میں بھی اپنے رُوح پرور جلوے دکھاتا ہے ، ہاں جو تاثیرِ آہنگِ شعر میں ہے وہ عموماً رنگِ نثر میں میسر نہیں آتی - فلسفہ ذہن اور عقل کو قائل کرتا ہے اور شعر دل کو مسحور کر کے ورغلا لیتا ہے — ہاں تو علامہ نے اسی تجدید مذاق پر اپنے اس خطبے میں بھی بحث کی ہے جس کا عنوان ہے ''خودی ، جبر و قدر ، حیات بعد الموت'' — چنانچہ وہ

۱- بانگِ درا ، ص ۲۳۳/۲۳۴ -

فرماتے ہیں :

''دراصل حیات بعد الموت کوئی خارجی حادثہ نہیں ، یہ خودی کے اندر ہی ایک حیاتی عمل کی تشکیل ہے اور جسے انفرادی یا اجتماعی جس لحاظ سے دیکھیے دونوں صورتوں میں محاسبۂ ذات کی وہ ساعت ہے جس میں خودی اپنے گوشۂ اعمال کا جائزہ لیتی ہے اور مستقبل میں اپنے ممکنات کا اندازہ کرتی ہے ۔ قرآن مجید کا بھی یہی ارشاد ہے کہ ہم حیاتِ ثانیہ کا قیاس خلقِ اول کی مماثلت پر کریں ۔[1]

و یقول الانسان ءاذا مامت لسوف اخرج حیا اولا یذکر الانسان انا خلقنٰہ من قبل ولم یک شیئا[2]

''اور انسان کہتا ہے کہ جب میں مروں گا تو بھلا پھر زندہ کر کے نکالا جاؤں گا ۔ کیا انسان کو یاد نہیں کہ ہم اس کو اس سے قبل خلق کر چکے ہیں درانحالیکہ وہ کچھ نہ تھا ۔''

نحن قدرنا بینکم الموت و ما نحن بمسبوقین ۙ علٰی ان نبدل امثالکم و ننشئکم فی ما لاتعلمون ۔ ولقد علمتم النشاۃ الاولٰی فلولا تذکرون ۔[3]

''ہمیں نے تمہارے درمیان موت کو ٹھہرا رکھا ہے اور ہم اس سے عاجز نہیں کہ تمہاری جگہ تم جیسے دوسرے (آدمی) پیدا کر دیں اور تم کو ایسی صورت میں بنا دیں جس کو تم جانتے ہی نہیں ۔ اور تم کو خوب علم ہے پیدائش اول کا ۔ پھر تم سمجھتے کیوں نہیں ۔''

۱- تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ ، ص ۱۸۲ ۔
۲- قرآن کریم ۔ سورہ ۱۹ ، آیت ۶۶ ، ۶۷ ۔
۳- '' '' ۔ سورہ ۵۶ ، آیت ۶۰ ، ۶۱ ، ۶۲ ۔

جو بات حضرت علامہ نے کشتیٔ ملاح ، جوئے آب ، بکھرے ہوئے قطراتِ آب اور پھر تخمِ گل کی تشبیہوں کے سہارے شاعرانہ انداز میں سمجھائی وہی بات خطبات میں فلسفیانہ رنگ اختیار کر گئی اور اس فلسفے کو قرآن کریم کی تائید حاصل ہے - یا یوں کہیے کہ علامہ کو یہ فلسفہ قرآن کے مطالعہ نے عطا کیا - بہرحال یہ تو واضح ہے کہ علامہ حیات بعد الموت پر یقین رکھتے ہیں اور جس طرح ان کے نزدیک تخمِ گل ریز خاک بظاہر سویا ہوا ہے مگر اپنی باز پیدائی کے لیے قوت جمع کر رہا ہے ، اسی طرح انسانی خودی بھی بیکار نہیں رہتی ، وہ برزخ میں بھی اپنے تکمیلی مراحل طے کرنے کی سعی میں مصروف رہتی ہے - جیسا کہ اوپر بیان ہوا ''یہ خودی کے محاسبۂ ذات کی ساعت ہے - یا مثلاً بقول حضرتِ علامہ ایک مردہ صد سالہ قبر سے پوچھتا ہے :

کیا شے ہے ؟ کس امروز کا فردا ہے قیامت ؟
اے میرے شبستانِ کہن ! کیا ہے قیامت ؟[1]

قبر جواب دیتی ہے -

اے مردۂ صد سالہ تجھے کیا نہیں معلوم ؟
ہر موت کا پوشیدہ تقاضا ہے قیامت ![2]

برزخ کو ''موت اور حیات بعد الموت کے درمیان توقف و انتظار کی ایک حالت سے تعبیر کرنا چاہیے -''[3] اور اگر یہ توقف ''محاسبہ ذات کی ساعت'' ہے تو پھر ظاہر ہے کہ شعور کا انقطاع عمل میں نہیں آتا ، بالفاظِ دیگر زندگی کا تسلسل بحال رہتا ہے -

---

۱- ارمغانِ حجاز (اردو) ، ص ۱۹/۶۶۱ -
۲- ایضاً -
۳- تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ ، ص ۱۷۶ -

البتہ بقول علامہ ''جو امر متنازعہ فیہ ہے یہ ہے کہ انسان کی حیاتِ ثانیہ پر اس کا جسم بھی پھر سے زندہ ہو جائے گا یا نہیں۔ زیادہ تر خیال یہ ہے اور شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی رائے بھی، جن کی ذات پر گویا الٰہیات اسلامیہ کا خاتمہ ہو گیا، یہی تھی کہ حیات بعد الموت پر ایسا کوئی مادی پیکر ناگزیر ہے جو خودی کے نئے ماحول میں اس کے مناسبِ حال ہو۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ان کے نظریے کی حقیقی وجہ یہ ہے کہ جب ہم خودی کا تصور بحیثیت ایک فرد کے کرتے ہیں تو ضروری ہو جاتا ہے کہ اسے کسی مقام یا اختیاری پس منظر سے نسبت دیں''[1] — لُبِ لباب یہ کہ بعث بعد الموت ایک حقیقت ہے، جو شے معلوم نہیں وہ یہ ہے کہ ''اس کی ماہیت کیا ہے — اور یہی سوال ''اک چبھتا ہوا کانٹا دلِ انسان میں ہے''۔

آیا انسانی زندگی کا انحصار جسم پر ہے یا روح پر، پروفیسر B. L. Atreya نے امام غزالی کے سے انداز میں بحث کی ہے اور لکھا ہے ''وہ لوگ جو یہ سمجھتے ہیں کہ مرنے کے ساتھ آدمی بحیثیتِ شخص اور فرد بھی فنا ہو جاتا ہے اُن کا خیال غلط فہمی پر مبنی ہے۔ چونکہ وہ جسم کو ایک ٹھوس صورت میں محسوس کرتے ہیں لہٰذا اسے ''ہست'' جانتے ہیں اور ورائے جسم انہیں کچھ نظر نہیں آتا، کچھ محسوس نہیں ہوتا، لہٰذا وہ ''نیست'' ہے۔ گویا جسم ہے تو شخص ہے ورنہ نہیں۔ اس کی مثال تو ایسی ہے جیسے کوئی کہے کہ بلب ہے تو بجلی ہے ورنہ نہیں۔ یعنی اگر بلب ٹوٹ جائے یا بجھ کر رہ جائے تو بجلی کی رو بھی ختم ہو کر رہ گئی۔ اسی ضمن میں ذرا آگے چل کے پروفیسر اتریہ لکھتے ہیں کہ ''خواب کے عالم میں ہمارا ادراک بالحواس کارفرما ہوتا ہے حالانکہ اس وقت طبعی حواس کام نہیں کر رہے ہوتے، وہ اس وقت سکون کی حالت

۱- تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ص ۱۸۴ -

میں ہوتے ہیں ۔ گویا ایک خوابی جسم ہے جو مصروفِ کار ہے جب کہ طبعی (مادی) جسم غیر متحرک ہے ۔ اس وقت طبعی وجود خوابی وجود کے سارے دھندوں سے آزاد ہوتا ہے ۔ اس لیے جسم کے مردہ ہو جانے کے باعث یہ فرض کر لینا کہ شخص ختم ہو گیا ہے ، کوئی قابلِ قبول مفروضہ نہیں ۔"[1]

کانٹ کی طرح پروفیسر اتریہ بھی کہتے ہیں کہ اگر دنیا کسی معقولیت پر استوار ہے اور محض مہمل نہیں تو پھر شخص کی بقا واجب ہے ۔ گویا وہ بھی بقائے شخص کو ایک اخلاقی تقاضا جانتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ امر بالکل نا معقول ہے کہ ہماری ہر محنت اور کدوکاوش نابود ہو کر رہ جائے اور اپنے مطلوب ثمرے حاصل کرکے تسکین یاب نہ ہو ۔ حضرت علامہ کی طرح اتریہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ایک اخلاقی ، دلجو اور عالی ظرف شخصیت کا ہزار مشقتوں ، عرق ریزیوں اور خوں فشانیوں کے بعد وجود میں محض اس لیے آنا کہ اسے موت (فنا) کے گھاٹ اتار دیا جائے بالکل لایعنی اور مہمل تصور ہے ۔ کیا موت کے ہاتھوں دنیا کے مسیح ، نیرو اور واشنگٹن برابر اور ہم سطح کرکے رکھ دیے جا سکتے ہیں ؟ کیا شہداء اور وہ قاتل جن پر لعنت برستی رہی ہو ، ایک ہی کشتی میں سوار کر دیے جائیں گے ؟[2]

اسی اخلاقی تقاضے کی قدرے مزید وضاحت کی خاطر ہم ایک اقتباس درج کرتے ہیں جو دلچسپی سے خالی نہیں ۔ "تصورِ کائنات اور تصورِ اخلاق کے اختلافات کی بنا پر عاقبت یا انجام کے تصورات میں بلا شبہ اختلاف رہا ہے لیکن فی نفسہ انجام کا کوئی نہ کوئی

---

1. "An Introduction to Parapsychology"
کمار پبلی کیشن بنارس (بھارت) ، ص ۱۶۰ ، ۱۶۱ ۔
۲۔ ایضاً ، ص ۱۶۵ ، ۱۶۶ ۔

تصور کارفرما رہا ہے، اواگون، نروان، حیات بعد موت حتٰی کہ اشتراکیت کا بعد التاریخ (Post-History) بھی تصورِ اخلاق، قانونِ مکافات اور تصورِ آخرت کی مختلف شکلیں ہیں۔ انسان اپنی فطرت پر ہزار پردے ڈالے لیکن وہ اخلاقی حس سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔ یہی اخلاقی حس ہے جس سے کام لے کر انسان نے ہر عہد میں اپنی دلی طمانیت کا سامان فراہم کیا ہے۔ یہی اخلاقی حس ہے جس نے ادب کو شاعرانہ عدل (Poetic Judgement) کی صنف سے مالا مال کیا ہے۔ شیکسپیر کا ڈرامہ ہیملٹ اس لیے ایک خزینہ کہلایا کہ شہزادہ ہیملٹ کا انجام از روئے انصاف وہ نہیں ہونا چاہیے تھا جو ہوا۔"[1]

ہاں کچھ وہ لوگ بھی ہیں جن کے لیے ظاہری موت کے بعد برزخ عام معنوں میں برزخ نہیں۔ خواہ وہ برزخ جسے علامہ اقبال محاسبہ ذات کی ساعت قرار دیتے ہیں طویل المدت ہو یا قصیر المہلت۔ وہ ایسے لوگ ہیں جن کو قیامت کی گھڑی بھی مار نہ سکے۔ بقول حضرت علامہ "قرآن مجید کے نزدیک انسان کی انتہائی مسرت اور سعادت یہ نہیں کہ اپنی متناہیت سے محروم ہو جائے۔ اس کے اجرِ غیرممنون کا مطلب ہے اس کے ضبطِ نفس، اس کی یکتائی اور بحیثیت ایک خودی اس کی فعالیت کا زیادہ سے زیادہ شدت اختیار کر جانا، حتٰی کہ عالمگیر تباہی کا وہ منظر بھی جس کی ابتدا قیامت ہوگی، اس قسم کی تربیت یافتہ خودی کے سکون و اطمینان پر قطعاً اثر انداز نہیں ہوگا۔

و نفخ فی الصور فصعق من فی السمٰوٰت و من فی الارض الا من یشاء اللہ[2]

۱۔ اقبال ریویو کراچی (جولائی ۱۹۶۲ء) مقالہ "اقبال کا فلسفۂ خودی اور تصورِ آخرت" (از منظور عباسی)، ص ۳۱۔

۲۔ قرآن کریم۔ سورہ ۳۹، آیت ۶۸۔

''اور صور پھونکا جائے گا تو ان سب کے ہوش اڑ جائیں گے جو آسمانوں اور زمین میں ہیں بجز اس کے جس کو اللہ چاہے۔''

لیکن ظاہر ہے کہ اس قسم کے استثنا کا اطلاق انہی شخصیتوں پر ہو سکتا ہے جن میں خودی کی شدت انتہا کو پہنچ گئی ہو۔''[1] حضرت علامہ نے اسی بات کو ضربِ کلیم میں زیرِ عنوان ''حیاتِ ابدی'' اس طرح بیان کیا ہے:

زندگانی ہے صدف ، قطرۂ نیساں ہے خودی
وہ صدف کیا کہ جو قطرے کو گہر کر نہ سکے

ہو اگر خودنگر و خودگر و خودگیر خودی
یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے![2]

یہ موت سے بھی مر نہ سکنا بڑی جدوجہد چاہتا ہے، یہ مقام ہر ایک کے لیے مقرر نہیں۔ اس امر پر حضرت علامہ کے اپنے تشریحی کلماتِ ذیل لائقِ توجہ ہیں۔

''لہٰذا یہ امر کہ خودی فنا ہو جائے گی یا اس کا کوئی مستقبل ہے عمل پر موقوف ہے اور اس لیے خودی کو برقرار رکھیں گے تو وہی اعمال جن کی بنا اس اصول پر ہے کہ ہم بلا امتیاز من و تو خودی کا احترام کریں۔ لہٰذا بقائے دوام انسان کا حق نہیں۔ اس کے حصول کا دارومدار ہماری مسلسل جدوجہد پر ہے۔ بالفاظِ دیگر ہم اس کے امیدوار ہیں۔''[3]

مطلب یہ کہ حیاتِ جاوداں اور حیات بعد الموت ایک شے نہیں۔ حیات بعد الموت کا حادثہ یا واقعہ ہے تو مگر آن کے لیے

۱۔ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ص ۱۷۸، ۱۷۹۔
۲۔ ضربِ کلیم، ص ۹۳/۳۱۔
۳۔ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ص ۱۸۰۔

جو مریں - حیات جاوداں کا معنی ہے کہ خودی نے اپنے عمل اور سعی کی بدولت اگر اسی زندگی میں اتنا استحکام پیدا کر لیا ہے کہ موت کے صدمے سے محفوظ رہے تو اس صورت میں موت بھی ایک راستہ ہی تصور کیا جائے گا۔ ''وہ راستہ جسے قرآن نے برزخ کہا ہے - یہی وجہ ہے کہ جب ہم باطنی واردات اور مشاہدات سے رجوع کرتے ہیں تو اُن سے بھی یہی مترشح ہوتا ہے کہ برزخ نام ہے شعور کی اس حالت کا جس میں زمان و مکان کے متعلق خودی کے اندر کچھ رونما ہو جاتا ہے۔''[۱] یعنی وہ لوگ جن کی خودی مستحکم ہے ان کے لیے برزخ بس یہی کچھ ہے کہ زماں و مکاں سے متعلق ان کے اندر کچھ ''تغیر رونما'' ہو جائے اور بس ، یہ موت اس شخص کی موت سے مختلف ہے جس کی خودی غیر مستحکم ہو -

لیکن ''طے شود جادۂ صد سالہ بآہے گاہے'' کے مصداق تربیت خودی کے مراحل بڑی شدید سرعت سے بھی قطع ہو سکتے ہیں - اگر تربیتِ خودی سے مقصود یہ ہے کہ روح ہرفانی وجود کی محبت کے بندھن سے آزاد ہو اور مردِ مومن یکسو ہو کر فقط احکامِ الٰہی کا پابند ہو جائے اور اس طرح اپنے اندر مولائی صفات پیدا کرکے موت سے مامون ہو جائے تو ظاہر ہے کہ وہ موت جو راہِ خدا میں اور احکامِ الٰہی کے اتباع میں بصد شوق قبول کی جائے اس سے بڑی گواہی اور شہادت اس امر پر اور کیا ہوگی کہ ایسی موت خریدنے والے شخص نے ہر محبت کو اپنے محبوبِ حقیقی کی محبت سے وار دیا - فی سبیل اللہ موت کو علامہ اقبال نے ہجرت سوئے دوست قرار دیا ہے ، کہتے ہیں :

جنگ مومن چیست ہجرت سوئے دوست
ترک عالم اختیارِ کوئے دوست

۱- تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ ، ص ۱۸۱ -

آنکہ حرفِ شوق با اقوام گفت
جنگ را رہبانیٔ اسلام گفت

کس نداند جز شہید ایں نقطہ را
کو بخون خود خرید ایں نقطہ را[1]

مطلب یہ کہ شہید کے لیے وہ برزخ نہیں جو نا تربیت یافتہ خودی کے مالکوں کا ہوتا ہے۔ موت کی ظاہری صورت ایک سی ہوتی ہے، باطنی صورت مختلف ہوتی ہے۔ اس باب میں محمد حسین صاحب عرشی کے بیان کا اندراج دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ وہ حضرت علامہ سے اپنی ایک ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں :

"اس کے بعد میں نے حیات بعد الممات سے متعلق استفسار کیا۔ آپ نے فرمایا حیاتِ آخروی انسان کے ذوقِ حیات کی شدت پر منحصر ہے، جس قدر کسی میں ذوقِ زندگی زیادہ ہوگا اتنا ہی اس کا زمانۂ برزخ کم ہوگا۔ شہداء کا ذوقِ زندگی بہت بڑھا ہوا ہے اس لیے ان کے لیے کوئی برزخ نہیں، اس زندگی سے آنکھ بند کرتے ہی ان کے لیے زندگی کا دوسرا دروازہ کھل جاتا ہے۔" میں نے ذکر کیا عام مؤمنین کے لیے بھی برزخ کا کہیں ذکر نہیں، فرمایا "اس کا سبب ذوقِ حیات ہے۔ میں نے اس خیال کو ایک شعر میں بھی ظاہر کیا ہے۔

جانے کہ بخشند دیگر نگیرند   آدم بمیرد از بے یقینی!"[2]

قرآن کریم کا بھی یہی ارشاد ہے "و لا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللہ امواتاً ط بل احیاء عند ربھم یرزقون"[3] (اور جو لوگ اللہ کی

۱- جاوید نامہ، ص ۱۸۶/۷۷۴ -
۲- ملفوظاتِ اقبال، محمود نظامی، اشاعت منزل لاہور، ص ۶۲ -
۳- قرآن کریم - سورہ ۳، آیت ۱۶۹ -

راہ میں مارے گئے ہیں انہیں ہرگز مردہ مت خیال کرو ، بلکہ وہ لوگ اپنے پروردگار کے پاس زندہ ہیں - رزق پاتے رہتے ہیں -)

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت علامہ کا قول کہ ”بقائے دوام انسان کا حق نہیں“ قرآن کے مخالف نہیں - اس فقرے کا معنٰی عام طور پر یہ لیا جاتا ہے کہ حیات بعد الموت سب کے لیے نہیں ، یعنی کچھ ایسے بھی ہوں گے جو دوبارہ جی اٹھنے کے قابل نہ ہوں گے ، لہذا اٹھائے ہی نہ جائیں گے - مسلمان حکما میں سے بعض اس خیال کے حامی ہیں کہ قیامت کو وہی اٹھائے جائیں گے جو حیات ِ ثانیہ کے اہل ہوں گے - مثلاً ابو نصر فارابی کا قول محمود عقاد صاحب نے نقل کیا ہے :

و یذھب الفارابی علٰی ھذا الترتیب فی التفرقة بین الانسان والانسان بمقدار حظہ من القوة الناطقة - فیجیز ان یکون بعض اشباہ الاٰدمیین بالصورة الجسدیة غیر محاسبین او غیر اھل للحیاة الاخریٰ[1]
”اور فارابی قوت ِ ناطقہ کی مقدار کے حساب سے آدمی اور آدمی میں فرق کرتا چلا جاتا ہے - چنانچہ پھر جائز جاننے لگتا ہے اس امر کو کہ وہ وجود جو آدمیوں سے محض جسدی مشابہت رکھتے ہیں ممکن ہے ان کا محاسبہ ہی نہ ہو یا یوں کہہ لیجیے کہ وہ دوسری زندگی کے اہل ہی نہ ہوں -“

مگر علامہ اقبال تو وکلھم اتیہ یوم القیٰمة فردا[2] کی روشنی میں اس بات کے قائل ہیں کہ ہر فرد کو الگ الگ اپنی ذمہ داری کا حساب دینے کے لیے اللہ تعالٰی کے یہاں پیش ہونا پڑے گا - فقط اتنا

۱- الانسان فی القراٰن - دارالکتاب العربی بیروت، ص ۹۵ - عقاد صاحب نے فارابی کی یہ عبارت کہاں سے نقل کی ، اس کا حوالہ نہیں دیا -
۲- قرآن کریم - سورہ ۱۹ ، آیت ۹۵ -

خیال رہے کہ بقائے دوام اور حیات بعد الممات ایک شے نہیں ۔ بقائے دوام سے ان کی مراد ہے کہ موت نہ آئے ۔ جیسا کہ ابھی اوپر بیان ہوا یعنی برزخ بھی نہ ہو ۔ اس لیے کہ وہ نفوس جنہیں اطمینان حاصل ہو چکا ہو وہ اپنے رب کے پاس خوشی کے عالم میں لوٹتے ہیں اور انہیں خوشی کے ساتھ قبول کر لیا جاتا ہے ۔ ''یا ایتھا النفس المطمئنة ارجعی الیٰ ربک راضیة مرضیة فادخلی فی عبادی وا دخلی جنتی''[1] — اے اطمینان والی روح تو اپنے پروردگار کی طرف لوٹ ، خوش ہوتی ہوئی اور خوش کرتی ہوئی ۔ پھر تو میرے (خاص) بندوں میں شامل ہو جا اور میری جنت میں جا داخل ہو ۔

البتہ علامہ اقبال کے ایک فقرے نے دقت پیدا کر دی ہے ۔ وہ اپنے خطبے ''خودی ، جبر و قدر اور حیات بعد الموت'' میں برزخ کے متعلق کہتے ہیں ''بالفاظِ دیگر یہ وہ کیفیت ہے جس میں نفسِ انسانی کے اندر زبردست اختلال رونما ہوتا ہے ۔ بالخصوص اُن انسانوں میں جنھوں نے اپنی ذاتی نشوونما میں انتہائی مدارج طے کر لیے ہیں اور جن کی خودی زمان و مکان کے ایک مخصوص نظام میں کسی مقررہ طرزِ عمل کی عادی ہو چکی ہے ۔ اندریں صورت یہ بھی ممکن ہے کہ بعض بدقسمت (Less Fortunate) انسان اپنی ہستی ہی کھو بیٹھیں ۔ خودی کو بہرحال اپنی جدوجہد جاری رکھنا ہے تاکہ اس میں حیات بعد الموت کی صلاحیت پیدا ہوجائے ۔''[2]

علامہ نے خودی اور اس کے تقاضائے استحکام پر جس اصول کے تحت روشنی ڈالی ہے اس کا منطقی نتیجہ تو یہی ہونا چاہیے تھا کہ وہ افراد جن کی خودی خام رہ جائے شاید وہ حیات بعد الموت کے اہل قرار نہ پائیں اور ناپید ہوجائیں ۔ علامہ نے ''ممکن'' کہا ہے ،

۱- قرآن کریم - سورہ ۸۹ ، آیت ۲۷ ، ۲۸ ، ۲۹ ، ۳۰ -
۲- تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ ، ص ۸۲ -

حتماً نہیں کہا ۔ تاہم یہ قیاس بھی ''وکلھم اتیہ یوم القیٰمۃ فردا'' کے خلاف ہے ۔ لہٰذا ہم یہاں حیات بعد الموت سے محرومی کا معنٰی یہ لیں گے کہ ایسے افراد کا برزخ میں سلسلۂ شعور منقطع رہے گا اور وہ تا حشر اس محرومی کا شکار رہیں گے ۔

ہاں وہ ایک چبھن جہاں تھی وہیں رہی جس پر قبل ازیں بھی بحث ہو چکی ہے کہ آیا حشر یا بعث جسم کے ساتھ ہو گا ۔ اور اگر جسم کے ساتھ ہوگا تو کیا یہی جسم جو آج ہے وہی دوبارہ ملے گا یا کوئی نیا جسم ہوگا ۔ امام غزالی کہتے ہیں کہ اصل شخصیت روح ہے ، شخص جو کچھ ہے محض جسم کی بدولت نہیں ۔ وہ جسم کو روح کا ظاہری پیکر جانتے ہیں ۔ اس کا استدلال کچھ یوں ہے کہ ایک قطرے کے سے ظاہری وجود سے لے کر نوزائیدہ بچے تک اور پھر براستہ جوانی بڑھاپے تک انسان کے ظاہری پیکر نے کیا کیا انقلاب دیکھے اور اس ظاہری پیکر کی تعمیر میں کس کس قسم کی سبزی ، کیسے کیسے غلے ، اور کس کس جانور کے گوشت نے حصہ لیا ، اس کے باوجود وہ شخص ایک ہی رہا[1] ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ غزالی کے نزدیک کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کوئی شخص قیامت کے روز کس بدن کے ساتھ دوبار جلوہ گر ہوگا یا اگر اس کا برزخ نہیں اور وہ ایک حیات کا مرحلہ طے کرکے دوسری حیات شروع کر دیتا ہے تو کس وجود کا مالک ہوگا ، روح وہی ہو ، جسم کوئی ہو ۔

حضرت علامہ کا رحجان بھی اسی جانب ہے کہ بعثت ثانیہ کے وقت آدم کو کوئی نہ کوئی جسدِ عنصری حاصل ہوگا ، یا یوں

۱- تہافتہ الفلاسفہ ، مطبع الکاتولیکیہ ، بیروت (۱۹۶۲ء) ، ص ۲۴۴ ، ۲۴۵ ۔

کہہ لیں کہ وہ باجسم بعثتِ ثانیہ کو ناممکن نہیں جانتے۔ وہ لکھتے ہیں :

''بہرحال فلاسفۂ اسلام اور علمائے الٰہیات کے درمیان جو امر مختلف فیہ ہے وہ یہ ہے کہ انسان کی بعثتِ ثانیہ پر کیا اس کا جسم بھی پھر سے زندہ ہو جائے گا۔ اس میں زیادہ تر تو خیال یہ ہے اور شاہ ولی اللہ کی رائے بھی، جن کی ذات پر گویا الٰہیات اسلامیہ کا خاتمہ ہو گیا، یہی تھی کہ حیات بعد الموت پر ایسا کوئی مادی پیکر ناگزیر ہے جو خودی کے نئے ماحول میں اس کے مناسب حال ہو۔۔۔۔ البتہ نہیں معلوم تو یہ کہ یہ سب کچھ کیسے ہوگا۔ قرآن نے بھی اس سلسلے میں جن مماثلتوں کی طرف اشارہ کیا ہے آن سے مقصود صرف یہی ظاہر کرنا ہے کہ بعثتِ ثانیہ ایک حقیقت ہے، یہ نہیں کہ اس کی ماہیت کیا ہے۔ لٰہذا جہاں تک فلسفے کا تعلق ہے ہم اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ انسان کے ماضی پر غور کیجیے تو یہ مطلب کچھ غیر اغلب نظر آتا ہے کہ اس کی ہستی کا سلسلہ جسم کی ہلاکت کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔''[1]

یہ نکتہ میں نے سیکھا بوالحسن سے
کہ جاں مرتی نہیں مرگ بدن سے

چمک سورج میں کیا باقی رہے گی
اگر بیزار ہو اپنی کرن سے![2]

اس مادی دور میں جب کہ ہر انسان اپنے انفرادی مستقبل کے بارے میں اس قدر مایوس ہے کہ زندگی کو سر تا سر مہمل اور بے معنی جاننے لگا ہے، حیات بعد الموت پر یقین کے مضامین کو

۱- تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ص ۱۸۴، ۱۸۵ -
۲- بالِ جبریل، ص ۳۷۹/۸۷ -

عام کر دیا جانا چاہیے ۔ حیات بعد الموت کا تصور اگر عقیدے کی شکل اختیار کر لے تو حیاتِ آدم کی بہت سی لایعنیت ختم ہو جائے اور آدمی اس عقیدے کی بدولت ایک زندہ امید سے ہمکنار ہو کر اپنے وجود کو اور اپنے ماحول کو ایک نئی نظر سے دیکھنے لگ جائے۔ مگر مادہ پرستوں کی باری تو بعد میں آئے گی ، پہلے یہ حقیقت ان لوگوں کے دل میں جا گزیں کرنے کی ضرورت ہے جو اس عقیدے کا اقرار کرتے ہیں اور اس کے باوصف موت سے ڈرتے ہیں ۔

مسلماں زادہ و نامحرمِ مرگ! ز بیمِ مرگ لرزاں تادمِ مرگ!
دلے در سینۂ چاکش ندیدم دمِ بگسستۂ بود و غمِ مرگ!

۱- ارمغانِ حجاز ، ص ۹۱۷/۳۵ ۔

میانِ ما و بیت الله رمزیست
کہ جبریلِ امیں را ہم خبر نیست !

علامہ اقبال کا تصورِ ملت
ماضی ، حال ، استقبال

ملت کے لفظ کی وضاحت ضروری ہے ۔ ملت کا لغوی معنٰی دین ہے اور قرآن کریم میں یہ لفظ انہی معنوں میں آیا ہے ۔ چنانچہ ملتِ اسلام کا مطلب ہوا دینِ اسلام ۔ مگر رفتہ رفتہ ملتِ اسلام کی جگہ خالی ملت رہ گیا اور ہوتے ہوتے ملت سے وہ جمعیتیں مراد لی جانے لگیں جن کا دین اسلام تھا ۔ بالفاظ دیگر ''ملت'' تقریباً وہی معنٰی اور مفہوم ادا کرنے لگا جو لفظ امت ادا کرتا ہے ۔ اب پورے عالمِ اسلام کو امتِ اسلام بھی کہا جاتا ہے اور ملتِ اسلام بھی ۔ اس طرح گویا ملت اور امت تقریباً ہم مفہوم کلمے بن گئے ، یہ الگ بات ہے کہ اصلاً امت کا مفہوم بہت وسیع ہے ۔

ملت سے کمتر اور ملت کے مقابل اور بعض اوقات ملت سے متصادم جو لفظ ہے وہ قوم ہے جس کا انگریزی مرادف ''نیشن'' ہے ۔ انگریزی زبان میں امت یا ملت کی اصطلاح کے لیے شاید کوئی لفظ نہیں ۔ لہٰذا ملت کو بھی نیشن اور امت کو بھی نیشن کہہ دیا جاتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ''نیشن'' کے لفظ کی تاریخی دلالتوں کے باعث اس لفظ کی معرفت ملت کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کرنے والوں کے پلے وہ مفہوم ہرگز نہیں پڑتا جسے مسلم امت کے اہلِ دل بخوبی سمجھتے ہیں ۔ انگریزی میں ملت کے لیے نیشن ہڈ (Nationhood) استعمال کیا جاتا ہے مگر وہ بھرپور معنٰی جو ملت یا امت میں پوشیدہ ہے اس میں کہاں ۔

ظاہر ہے کہ افراد سے کنبے بنے ، کنبوں سے قبیلے وجود میں آئے ، قبیلوں سے قومیتیں متشکل ہوئیں ، قومیتوں کا مجموعہ ''قوم'' کہلایا ۔ عمومی معنوں میں قوم جن عناصر پر استوار ہوتی ہے ان میں وطن ، نسل ، زبان ، تاریخ اور تمدن وغیرہ کے اشتراک کو اہمیت دی جاتی ہے ۔ پھر ان سب میں مقابلتاً سب سے زیادہ اہمیت اکثر قوموں کے یہاں وطن کو حاصل ہے ۔ وطن اگر مملکت (State) ہے جب بھی اور مملکت نہیں تو جب بھی کوئی نمایاں توصیفی فرق نہیں ۔ اگر ایک قوم اپنے وطن میں غلام بھی ہو جاتی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ قوم کی حیثیت سے نابود ہو گئی ، ہاں آزاد قوموں میں اس کا شمار نہ رہا ۔ ویسے حق یہ ہے کہ قوم کا لفظ ذہن میں آتے ہی ایک آزاد مملکت کا تصور ساتھ ہی ابھر پڑتا ہے یعنی Nation اور State لازم و ملزوم نہ سہی تاہم دونوں کا رابطہ نہایت قریبی ہے ۔ مگر میں یہاں اس بحث میں نہیں پڑتا کہ ہیگل ، یا رینان ، یا پرائس یا لاسکی یا ہل وغیرہ نے قوم اور ریاست کی کیا تعریفیں اور شرطیں پیش کی ہیں ۔ میں اپنی بات اپنے انداز میں اور اپنی تاریخ کے حوالوں سے بیان کرنے کی کوشش کروں گا ، دوسری قوموں سے تعلق رکھنے والے سیاسی مفکرین کی کوئی تحدید و تعریف اپنی تسلی نہیں کرتی ۔ ایک وطن میں ایک سے زیادہ نسلیں اور ایک سے زیادہ زبانیں بولنے والے گروہ پائے جا سکتے ہیں مگر وطن کی نسبت سے انہیں ایک قومی نام دے دیا جاتا ہے ۔ برطانیہ والے برطانوی بن گئے ، اٹلی والے اطالوی کہلائے ، سویٹزرلینڈ والے سویس ، کینیڈا والے کینیڈیائی اور امریکہ والے امریکی قرار دیے گئے ، وعلیٰ ہٰذالقیاس ۔ یوں تو ایک خاص نسل سے تعلق رکھنے والے بھی اپنے آپ کو ایک قوم ہی کہتے ہیں مثلاً جرمن ، اور وہ جرمنی سے باہر بھی پائے جاتے ہیں لیکن وہ جرمنی کے اندر قوم ہوں گے اور جرمنی سے باہر کسی اور وطن میں جہاں کسی اور قوم کو عددی غلبہ حاصل ہوگا وہاں جرمن گروہ کو قومیت (Nationality) کی حیثیت

ہوگی - اس طرح ہنگری میں آباد جرمنوں کی نفری اگر کسی عددی حیثیت کی مالک ہے تو جرمن نیشنلٹی کہلائے گی مگر مجموعی طور پر ہنگری کی نسبت سے ہنگروی ہی قرار پائیں گے - اس مسئلے میں کئی استثناآت بھی ہوں گے مگر عمومی کیفیت یہ ہے کہ ''قومیں وطن سے بنتی ہیں''-

یہودی ایک واضح استثنیٰ ہے - اس قوم کا سب سے اہم عنصر ترکیبی نسل ہے - یہودی کوئی بھی زبان بولیں اور کسی بھی علاقے میں رہیں ان کی اپنی نسلی اور مذہبی نسبت بہرحال بحال اور ممیز رہتی ہے - یہ الگ بات ہے کہ وہ جس جس علاقے میں آباد ہوں گے باشندے وہیں کے محسوب ہوں گے اور بظاہر اسی وطن کی نسبت سے وہیں کی قوم گنے جائیں گے - لہٰذا امریکہ کا یہودی امریکی قوم کا فرد ہے مگر خود اپنے نزدیک امریکی ہونے کے مقابل اس کا یہودی ہونا زیادہ اہم ہے - وہ بیک وقت امریکی قوم سے بھی تعلق رکھتا ہے اور یہودی قوم سے بھی - یہودیوں کو امت بھی قرار دیا جا سکتا ہے مگر محدود معنوں میں ، اس لیے کہ وہ لوگ فقط اسرائیلی نسل سے وابستہ ہیں - زبانیں بیشک الگ الگ ہوں ، وطن بھی جدا جدا ہوں لیکن نسلی امتیاز ان کی نمایاں علامت ہے - نسل کے ساتھ ہی رنگ کا تعصب بھی شامل ہو جاتا ہے - کوئی کالا حبشی یا کوئی زرد چینی کس طرح یہودی ہو سکتا ہے - پھر یہ کہ یہودی تبلیغی مذہب نہیں جو دوسری قوموں اور نسلوں کے افراد اور گروہوں کو اپنے اندر سمو لے -

لیکن جب ہم مسلمانوں کو دیکھتے ہیں تو وہ از روئے امت و ملت دوسروں سے بالکل جدا ہیں - ان کے یہاں بھی شعوب و قبائل ہیں ، ان کے یہاں بھی قومیتیں ہیں ، قومیں بھی ہیں مگر ان کی بین الاقوامی حیثیت فوق الاقوام ہے اور وہ حیثیت فوق الاقوام ہونے کے اعتبار سے وطنوں ، نسلوں ، رنگوں اور زبانوں سے برتر

ہو جاتی ہے ۔ پاکستان کو دیکھیے ، یہاں گوجر ، گکھڑ ، بلوچ ، خٹک وغیرہ قبائل موجود ہیں ، پھر علاقائی نسبت سے پنجابی ، سندھی ، پٹھان ، بلوچ قومیتوں کا وجود بھی پایا جاتا ہے لیکن سب مل کر پاکستان کی نسبت سے پاکستانی قوم ہیں ۔ پاکستانی قوم وطنِ پاکستان کی نسبت سے وجود میں آئی ۔ اس سے آگے کی نسبت ملت ہے اور وہ اسلام ہے جو سب مسلمانوں کا دین ہے ۔ وطن کی نسبت سے تشخص قومی قرار پایا اور دین کی نسبت سے ملی ۔ ملت کی اساس اشتراکِ عقیدہ ہے اور اس میں وطنی ، نسلی اور لسانی حدوں کو کوئی دخل حاصل نہیں ۔ جب ہم ملت کہتے ہیں تو علاقائی ، نسلی اور لسانی حیثیت دب کر رہ جاتی ہے ۔ اس طرح دیکھیں تو مسلمان پوری دنیا میں ایک منفرد برادری ہیں اور ان کا بین الاقوامی تشخص ان کا دین ہے ۔ جزیرہ فاک لینڈ کا مسلمان ہو یا جنوبی افریقہ کا ، کوریا کا مسلمان ہو یا سویڈن کا ، عرب کا مسلمان ہو یا ترکستان کا ، وہ گورا ہو یا کالا ہو ، گندمی ہو یا زرد ہو ، حامی ہو یا سامی ہو یا آریائی ، شاہ ہو یا گدا ، مسلمان ہونے کی نسبت سے ہر کہیں کے مسلمان کا بھائی ہے ۔ مطلب یہ کہ مسلم ملت کی اساس دیگر اقوام کی اساس سے مختلف ہے ۔ بقول حضرت علامہ

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی ؐ

ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری[1]

جدید یوروپی نظریے کے مطابق عموماً ”قومیں وطن سے بنتی ہیں“ مگر اسلام نے سب سے پہلے عملاً وطن ہی کو غیر اہم قرار

۱۔ بانگِ درا ، ص ۲۴۸/۲۴۸ ۔

دے دیا اور اس طرح وطن پر استوار "قومیت کے تصور" کو باطل کر دیا ۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں

عقدۂ قومیتِ مسلم کشود　　از وطن آقاے ما ہجرت نمود[1]

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکے سے ہجرت کر کے اس حقیقت کی وضاحت فرما دی کہ اسلام مکی الوطن نہیں ، نیز یہ کہ جب اور جہاں دین و وطن کے مابین تصادم ہوگا وہاں ترجیح دین کو حاصل ہوگی ، اس لیے کہ وطن دین کی خاطر ہے ، اگر کوئی وطن روحِ دین کی تنگی کا باعث ہو تو صاحبِ دین اس وطن کی حدود کو عبور کر جائے گا ۔ اسی لیے حضور نبی خاتمؐ نے فرمایا تھا کہ "الاسلام غریب" (اسلام پردیسی ہے) جس کا مطلب ہے اسلام کا کوئی مخصوص وطن نہیں ، ہر دیس اس کا دیس ہے ۔ گویا پردیسی کا معنٰی ہے "ہر دیسی" ۔ یوں دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ اسلام کی فطرت میں وسعت بھی ہے اور رفعت بھی ، یہ محدود ہو کر نہیں رہ سکتا ، یہ زمین کے ساتھ چپک کر نہیں رہ سکتا ، "دھرتی پوجا" کا تصور مردِ مومن کے ذہن میں سما ہی نہیں سکتا ۔

اصلِ ملت در وطن دیدن کہ چہ　　باد و آب و گل پرستیدن کہ چہ[2]

اس بات کو ایک اور مقام پر مزید واضح کرنے کی خاطر علامہ کہتے ہیں

ہجرت آئینِ حیات مسلم است　　این ز اسبابِ ثباتِ مسلم است
معنیٔ او از تنک آبی رم است　　ترک شبنم بہرِ تسخیرِ یم است![3]

۱- اسرار و رموز ، ص ۱۱۴/۱۱۴ -
۲- ایضاً ، ص ۹۳/۹۳ -
۳- ایضاً ، ص ۱۱۴/۱۱۴ -

یعنی ہجرت تو مسلمان کی زندگی کا دستور ہے اور یہی بات اسے استحکام اور ثبات عطا کرتی ہے - ہجرت کا مفہوم ہے تنگ ناؤں اور پایاب پانیوں سے کنارہ کشی ، وسعتوں اور گہرائیوں کی طلب - بالفاظ دیگر شبنم کو ترک کرنا اور سمندر کو مسخر کرنا - ایک اور جگہ پر علامہ اس نقطہ کی ثم مزید تشریح کرتے ہیں -

ہر کہ از قیدِ جہات آزاد شد چوں فلک در شش جہت آباد شد[۱]

ظاہر ہے کہ دھرتی پوجا تعصب اور نفرت کے بیج بوتی ہے - ایک علاقے سے محبت بہت بڑھ جائے تو دوسرے علاقے ہیچ نظر آتے ہیں اور وہاں کے رہنے والے بھی پوچ ہو کر رہ جاتے ہیں - اس ضمن میں ہندوؤں کی مثال بڑی نمایاں ہے - ابوالریحان البیرونی نے اپنی کتاب ''مالللہند'' میں بیان کیا ہے اور اس بیان کا تعلق باب اول کے ابتدائی صفحات سے ہے کہ ہندو لوگ فقط اپنے وطن کو پاک جانتے ہیں ، باقی ہر وطن کو پلید تصور کرتے ہیں - ان کی زبان میں غیر ملکی کو ملیچھ کہتے ہیں ، لیکن چونکہ ہر غیر ملکی غیر ملک سے آنے کے باعث پلید ہوتا ہے لہٰذا رفتہ رفتہ ملیچھ کا معنٰی ناپاک اور پلید ہوگیا - مقصد عیاں ہے کہ مادی رابطہ محدودیت پیدا کرتا ہے اور محدودیت کا نیتجہ ہے تعصب اور تنگ نظری -

ہندو قوم کا بیرون ہند سے رابطہ ہی کم رہا ہے ، لہٰذا وہ لوگ عالمی انسانی برادری کے تصور ہی سے محروم رہے ، پھر جن کے نزدیک ان کے وطن سے باہر کی ہر سرزمین گندی اور پلید ہو اور ہر غیر ملکی بمعنی غلیظ اور ناپاک ہو وہ اپنی حدود سے باہر برادری کا رشتہ استوار کریں بھی تو کیسے! بلکہ ذات پات اور چھوت چھات نے خود ہندوؤں کو ایک قوم کبھی نہ بننے دیا ، آج تک یہی حال ہے -

---

۱- اسرار و رموز ، ص ۱۱۵/۱۱۵ -

ایسی حالت میں وہ مسلمانوں کو یا دوسری کسی قوم کو کیسے اپنا جان لیتے - حد یہ ہے کہ معاصر دور میں جب کہ کائنات کی طنابیں کھنچ گئی ہیں ، کوئی ملک کسی ملک سے اور کوئی قوم کسی قوم سے دور نہیں رہی ، ہندو کی ذہنیت اور اس کے مزاج میں اجتماعی طور پر کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی -

صدیوں کے اثرات سالوں میں جائیں بھی کیسے! یہی حال یہودی قوم کا ہے ، وہ لوگ نسل کی قید سے آزاد نہ ہو سکے - چنانچہ دوسروں کا خون چوسنے اور انہیں اذیت دینے میں لذت محسوس کرتے ہیں - نسلی برتری ان کی اجتماعی نفسیات ہے - ان کے نزدیک دوسری نسلیں فروتر اور انسانی مقام سے محروم ہیں ، اس لیے ان کا مال اور ان کی جان یہودیوں کے نزدیک مباح - اس طرح یہود اور ہندو ''آدم بو'' کی نمایاں خاصیت کے وصفِ مشترک کے باعث ایک دوسرے کے بظاہر قریب آ سکتے ہیں مگر دونوں کی اجتماعی نفسیات ایسی ہے کہ اساساً ایک دوسرے سے دور ہی رہیں گے - ہندو اور یہودی تو نمایاں ترین مثالیں ہیں ، ان سے ہٹ کر کسی بھی ایسی قوم کو دیکھیں جس کی ترکیب میں وطن کو خصوصی اہمیت حاصل ہو تو وہ دوسرے وطنوں کے باشندوں کو اپنا جان ہی نہیں سکتی ، غیر ماتی ہے بلکہ اکثر اوقات دشمن اور بدخواہ تصور کرتی ہے - بقول حضرت علامہ

آنچناں قطع اخوت کردہ اند   بر وطن تعمیرِ ملت کردہ اند[1]

آدمی تو آدمی کا بھائی تھا - قرآن نے یہ پیغام سنایا تھا کہ اے بنو آدم! تم از روئے اصل ایک ہو اس لیے کہ تمہیں ایک ہی نفس (جان) سے پیدا کیا گیا ہے لیکن وطنی نسبت کے تعصبات نے یہ

۱- اسرار و رموز ، ص ۱۱۵/۱۱۵ -

رشتہ برادری کاٹ کر رکھ دیا۔

تا وطن را شمعِ محفل ساختند　　نوعِ انسان را قبائل ساختند[1]

مطلب یہ کہ ''دھرتی پوجا'' کے باعث انسانی برادری ایک ''نوع'' نہ رہی، گروہوں میں بٹ گئی۔ ظاہر ہے کہ یہ جذبہ مادہ پرستی کا مظہر ہے۔ آدمی اوپر کو نہیں اٹھتا، نیچے ہی کو جاتا ہے اور اس کی ہستی حیوانی ہستی ہی کے درجے تک رہ جاتی ہے، بڑھ کر انسانیت کے مقامِ بلند تک پہنچنا ایسے معاشروں کے بس میں نہیں ہوتا۔ حضرت علامہ کہتے ہیں:

''اسلام قیدِ وطن سے آزاد ہے۔ اس کا مقصد ہے ایک ایسے انسانی معاشرے کی تشکیل جو مختلف نسلوں اور قوموں کو باہم جمع کرتے ہوئے ایک ایسی امت تیار کرے جس کا اپنا ایک مخصوص شعورِ ذات ہو۔''[2]

وطن کے تشخص اور وطن کی نسبت کے بعد سب سے اہم رشتہ نسلی ہے۔ اسی سے رنگ بھی وابستہ ہے اور نسل کی برتری کا غرور بھی۔ اگر ذرا غور سے دیکھا جائے تو یہ کھلی بت پرستی ہے۔ پھر ہر بت پرست کی طرح نسل پرست بھی تنگ نظر اور پست فطرت ہو کر رہ جاتا ہے۔ عابد اپنے معبود کی علوِ شان کی نسبت سے بلند ہوتا ہے۔ مادی معبود کا پرستار آخر بلند ہو بھی تو کس قدر، اس میں بلند نظری اور عالی ہمتی رونما ہو ہی نہیں سکتی۔ لکڑی کو پوجنے والا لکڑی کی سی صفات غیر شعوری طور پر اپنے اندر پیدا کر لیتا ہے، پتھر کو پوجنے والا پتھر ہو کر رہ جاتا ہے اور خدائے تعالیٰ کا پوجنے والا اپنے اندر خدائی صفات اور خدائی رنگ

۱- اسرار و رموز، ص ۱۱۵/۱۱۵ -
۲- اقبال کے حضور، ص ۱۵ -

غیر شعوری طور پر پیدا کر لیتا ہے ۔ وہ مزاجاً بلند اور فطرتاً غیر محدود بن جاتا ہے اور از روئے قرآن اللہ کے رنگ سے بہتر اور حسین تر رنگ اور ہے بھی کون سا ؟ ہندو کے تعصب نے اسے بلند نہ ہونے دیا ۔ اس کی ”آدم بو“ نے اس کے معاشرے میں حرکت انقلاب پیدا نہ ہونے دی اور وہ معاشرہ جھیل مردار کی طرح ہو کر رہ گیا ۔ خود جواہر لال نہرو نے مسلمانوں کی آمد سے قبل کے ہندو معاشرے کو باسی اور بدبودار پانی کا جوہڑ قرار دیا تھا ۔ یہی عالم یہودی کا ہے ۔ اس کی بھی ”آدم بو“ نے اسے ہر دور اور ہر معاشرے میں ایک گالی بنا کر رکھ دیا ۔ بارہا عیسائیوں نے انہیں ان کے تعصب کی سزا دی ۔ جرمنوں نے ان کی نسل ہی کو اپنی سرزمین سے مٹا دینے کی کارروائی کی ۔ شاید کبھی عربوں کے ہاتھوں بھی انہیں تعصب کی ویسی ہی سزا ملے اور ممکن ہے یہودی کی خود غرضی اور تنگ نظرانہ کارروائی کسی وقت امریکی عوام کو بھی بھڑکا دے ۔ امریکہ کے انتظامی ، جنگی ، سیاسی ، تجارتی اور بین الاقوامی معاملات میں اگر امریکی یہودی اسی طرح مداخلت کرتے رہے ، اور ظاہر ہے کہ وہ باز آ بھی نہیں سکتے ، تو وہ دن دور نہیں جب امریکی پبلک ان کے اسی طرح درپے ہو جس طرح ہٹلر کے دور میں جرمن پبلک ہوئی تھی ۔ ہاں تو نسل پرستی نے اسود و احمر اور ابیض و اصفر کی تفریق کو بھی تقویت دی ، پھر ایک نسل نے اپنے لیے جو حقوق محفوظ جانے اس سے دوسروں کو محروم رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی ۔ جاہلی عربوں کے یہاں بھی نسل اور نسب کی عجیب و غریب حیثیت تھی ۔ ان کی نظر ان کے اپنے قبائلی گروہ کی حدود سے آگے نہ جاتی تھی ۔ قبائلی گروہ کو ”عصبہ“ کہتے تھے ، اسی گروہی وابستگی کی کیفیت نے شدت اختیار کر کے ”عصبیت“ اور پھر تعصب کی سی اصطلاحات پیدا کیں ، یعنی اپنے عصبہ (گروہ) کی ہر بات ٹھیک ، اور دوسرے گروہ کی ہر بات غلط ۔ اپنے گروہ میں کوئی ظالم نہیں ، کوئی جھوٹا نہیں ، کوئی مجرم نہیں ، کوئی قاتل نہیں ،

لٹیرا نہیں ، ڈاکو نہیں - اپنے گروہ کے ہر فرد کی دوسرے گروہوں اور افراد کے مقابل ہر حال میں حمایت لازم - جس سطح پر وہ عرب زندگی بسر کرتے تھے اس سطح پر وہ کچھ اور سوچ ہی کب سکتے تھے - یہ ان کی مجبوری تھی - لہٰذا وہ دس دس پشت اُوپر کے بھی ہم نسب افراد کو اپنے ''عم زاد'' جانتے تھے -

لیکن جس طرح اسلام نے دین کے مقابل وطن کی اہمیت کم کر دی اسی طرح نسل اور نسب کی حیثیت کو بھی دین کے مقابل گھٹا کر رکھ دیا - اسلام نے یہ تعلیم دی کہ اصل رشتہ دینی ہے - وطنی ، نسلی اور لسانی رشتہ دینی رشتے سے کمتر ہے - اگر دین اور برادری میں تصادم واقع ہوگا تو برادری کو دین پر قربان کر دیا جائے گا ، برادری کا رشتہ مادی ہے ، لہٰذا فانی -

بر نسب نازاں شدن نادانی است　　حکمِ او اندر تن و تن فانی است[1]

اس کے مقابل دین کا رشتہ روحانی ہے لہٰذا باقی ہے اور پائدار - مادی رشتہ محدود ہے اور غیر مادی رشتہ غیر محدود ہے - بقول حضرت علامہ ''اسلام ہی ہمارا وطن ہے ، اسلام ہی ہماری نسل ہے جیسا کہ حضرت سلمان فارسی رض نے فرمایا تھا ''سلمان ابن اسلام ابن اسلام -''[2] اس رشتے کو مرکزی حیثیت حاصل تھی اور اب بھی بڑی حد تک ہے - جن لوگوں نے اسلام قبول کر لیا وہ بھائی اور جن لوگوں نے اسلام قبول نہ کیا وہ غیر - حضرت بلال حبشی رض ، حضرت سلمان فارسی رض اور صہیب رومی رض تو اپنے بن گئے ، اور اپنے چچا ابولہب اور ابوجہل وغیرہ غیر ہو کر رہ گئے -

جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت فرمائی تو اپنی اسلامی برادری کو مدینے میں اکٹھا کر لیا ، اور خونی برادری کو

۱- اسرار و رموز ، ص ۹۲/۹۳ -
۲- اقبال کے حضور ، ص ۱۵۱ -

مکے میں چھوڑ گئے - غزوۂ بدر نے جو اولیں اہم غزوات میں سے ہے اس حقیقت کو مزید تقویت دے دی ، ایک طرف حضور صلی اللہ علیہ و سلم کی امت (ملت) تھی اور دوسری جانب آپؐ کی قوم تھی - آپؐ کی نسبی قوم قریش تو غیر بن گئی اور روحانی برادری سے رشتۂ یگانگت استوار ہو گیا ، وہ لوگ خواہ کسی بھی قبیلے ، قوم اور وطن سے تعلق رکھتے تھے وہ سب اپنے بن گئے - قریش ہم نسب بھی تھے ، ہم وطن بھی تھے ، ہم زبان بھی تھے اور ہم تاریخ و تمدن بھی (تمدن کا درجہ جیسا بھی تھا) اور پھر مدینہ اور مکہ والوں کے مابین کوئی قدیم لاگ ڈانٹ نہ تھی جس کی زد میں مکے سے ہجرت کر کے آنے والے آ گئے ہوں -

یہ کسی قدیم علاقائی یا نسلی عداوت کا مسئلہ نہ تھا ، یہ قریشی اور غیر قریشی کا مسئلہ بھی نہ تھا ، یہ مکی اور مدنی کا مسئلہ بھی نہ تھا - سیدھی سی بات ہے کہ یہ مسئلہ حق اور باطل کا مسئلہ تھا ، کفر اور اسلام کا مسئلہ تھا ، یہ نور اور ظلمت کا مسئلہ تھا اس لیے کہ یہ روح اور مادہ کا تصادم تھا - مدینہ شریف سے نکل کر میدانِ بدر میں ڈیرہ ڈالنے والی جمعیت امت تھی اور مکہ سے آ کر میدانِ بدر میں نعرۂ جنگ بلند کرنے والی قوم تھی — قومِ قریش -

ان دو مخالف صفتوں کی کیفیت عجیب تھی - رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ و سلم ایک طرف تھے اور آپ کے چچا عباس بن عبدالمطلب اور آپؐ کے داماد (حضرت زینبؓ کے خاوند) دوسری طرف ، حضرت عمرؓ ایک طرف تھے اور ان کا ماموں دوسری طرف ، حضرت علیؓ ایک طرف تھے اور ان کا حقیقی محسن چچا اور بھائی عقیل دوسری طرف ، حضرت ابو عبیدہؓ ایک طرف تھے اور ان کا والد جراح دوسری طرف ، حضرت حکمؓ بن سعید بن العاص ایک طرف تھے اور ان کا حقیقی بھائی عبیدہ بن سعید بن العاص دوسری

طرف ، حضرت ابو حذیفہؓ ایک طرف تھے اور ان کا والد عتبہ بن ربیعہ دوسری طرف ، اور ہاں حضرت ابوبکر صدیقؓ ایک طرف تھے اور ان کا فرزند عبدالرحمٰن دوسری طرف ، اور پھر ان قریشی اصحابؓ کے علاوہ حضرت سلمان فارسیؓ اور حضرت بلال حبشیؓ بھی تھے ، انصاری حضراتؓ بھی تھے - یعنی وہی بات کہ امت ایک طرف تھی اور قوم دوسری طرف - غرض غزوۂ بدر کا سب سے بڑا درس یہ ہے کہ اُمت مسلمہ ایک دینی ، روحانی ، اصولی اور نظریاتی برادری ہے - اس کی اساس نہ وطن ہے ، نہ خون ہے ، نہ نسل ، نہ زبان ، نہ دولت ، نہ اقتدار - حضرت علامہ نے جبھی تو کہا تھا -

گر نسب را جزوِ ملت کردۂ ، رخنہ درکارِ اخوت کردۂ [1]

ہر کہ پا در بندِ اقلیم وجد است ، بے خبر از لم یلد لم یولد است [2]

وہ لوگ جو ملت کے معاملات میں نسب کو لا داخل کرتے ہیں وہ اخوت کے مفہوم میں گڑ بڑ کر ڈالتے ہیں اور جن لوگوں کو آبائی گھمنڈ ہے وہ گویا اس خدا کے رنگ میں رنگے ہی نہیں گئے جو لم یلد بھی ہے اور لم یولد بھی - مطلب ہے کہ دین کے مقابلے میں کسی قریب سے قریب رشتے کو بھی کوئی اہمیت نہیں دی جا سکتی - اسی مفہوم کو حضرت علامہ نے شعر ذیل میں بیان کیا ہے کہ اگر دین نسب پر منحصر ہوتا تو آنحضورؐ اپنے حقیقی چچا کو دعوتِ دین کیوں دیتے -

ملت کی قوت اس کی روحانی یک جہتی ہے - یہ روحانی

۱- اسرار و رموز ، ص ۱۶۲/۱۶۲ -
۲- ایضاً ، ص ۱۶۳/۱۶۳ -

یک جہتی توحید و رسالت پر استوار ہے۔ اس عقیدے کا مختصر ترین اظہار مگر بھرپور اقرار کلمہ طیبہ ہے — لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ — ایک خدا ، ایک رسولؐ ، ایک کتاب ، ایک کلمہ ۔ اسی پر ملت کا سارا نظام ، ضبط ، قاعدہ ، اخلاق ، رویہ اور آہنگ مبنی ہے ۔ اس باب میں حضرت علامہ نے فرمایا :

ملت بیضا تن و جاں لا الٰہ | ساز ما را پردہ گرداں لا الٰہ
لا الٰہ سرمایۂ اسرارِ ما | رشتہ اش شیرازۂ افکارِ ما[1]

ایک اور مقام پر ارشاد ہوا ۔

از یک آئینی مسلماں زندہ است | پیکر ملت ز قرآں زندہ است[2]
طینتِ پاکِ مسلماں گوہر است | آب و تابش ازیمِ پیغمبرؐ است[3]

چونکہ ملتِ اسلامیہ کا عقیدہ اور آئین توحید و رسالت اور قرآن و سنت پر مرتکز ہے لہذا اس ملت کا زندگی ، ذات اور کائنات کے ضمن میں رویہ ایک ہی سا ہے ۔ اس کے یہاں پسند و ناپسند ، پاک و ناپاک ، حلال و حرام وغیرہ کے معیار یکساں ہیں خواہ بظاہر مسلم معاشرے ایک دوسرے سے سینکڑوں بلکہ ہزاروں میل دور ہی کیوں نہ ہوں ۔ متحدہ ہندوستان کی مرکزی اسمبلی کے صدر سر عبدالرحیم نے کہا تھا :

"ہم ہندوستانی مسلمانوں میں سے کوئی افغانستان ، ایران ، سنٹرل ایشا ، چینی مسلمانوں ، عربوں اور ترکوں کے یہاں سفر کر رہا ہو تو اس کی اجنبیت دور ہوتے ذرا دیر نہیں لگتی اور وہ یوں محسوس کرنے لگتا ہے گویا اپنے ہی گھر میں ہے ، اسے کوئی ایسی بات

۱۔ اسرار و رموز ، ص ۹۲/۹۲ ۔
۲۔ ایضاً ، ص ۱۲۵/۱۲۵ ۔
۳۔ ایضاً ، ص ۱۳۳/۱۳۳ ۔

نظر نہیں آتی جس کے ہم عادی نہ ہوں اور جو ہماری دیکھی بھالی نہ ہو مگر اس کے خلاف ہندوستان میں جب ہم اپنی گلی عبور کر کے اس حصے میں چلے جائیں جہاں ہمارے ہم شہر ہندو رہتے ہیں تو ہم تمام سماجی معاملات میں اپنے آپ کو ہندوؤں سے بالکل دور اور اجنبی پاتے ہیں۔"[1]

علامہ اقبال اس امر کی اشعار ذیل میں وضاحت فرماتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مسلمان ملت سے تعلق رکھنے والے معاشرے اور افراد کے مابین ستاروں کی طرح رشتۂ محبت و مودت قائم ہے مگر جس طرح ستاروں کی باہمی کشش آنکھوں سے دیکھ کر نہیں پہچانی جا سکتی اسی طرح ان کی باہمی محبت و مودت کا رشتہ بھی ظاہر کی آنکھ سے نہیں دیکھا جا سکتا۔ ذرا غور کرو تو یک رنگی، یک نظری، ہم خیالی اور ہم مالی موجود،

رشتۂ ایں قوم مثلِ انجم است   چوں نگہ ہم از نگاہِ ما گم است
تیرِ خوش پیکان یک کیشیم ما   یک نما، یک بیں، یک اندیشیم ما
مدعائے ما، مآلِ ما یکے ست   طرز و اندازِ خیالِ ما یکے ست[2]

حضرت علامہ فرماتے ہیں:

"اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام سے بہت پہلے مسیحیت نے نوعِ انسانی کو پیغامِ مساوات دیا تھا۔ مگر مسیحی روما اپنے اندر یہ اہلیت پیدا نہ کرسکا کہ "بنی آدم اعضائے یک دیگر اند" کے تصور کا صحیح اور کامل ادراک کر سکتا ہے۔"[3]

---

1. Meanings of Pakistan, by F.K Durrani, published by Sh. Ashraf, Lahore, p. 72.

۲۔ اسرار و رموز، ۹۳/۹۳۔

3. The Reconstruction of Religious Thought in Islam, p. 141.

چنانچہ عملاً نوعِ انسانی کو وطنی ، نسلی ، لونی ، لسانی وغیرہ قیود کے پیدا کردہ تعصبات سے بلند کر کے ایک برادری میں ڈھال دینے کا شرف اسلام ہی کو حاصل ہوا ۔ اور ظاہر ہے کہ اسلامی معاشرہ ہی اس دستاویزِ آزادی و اخوت کا وارث اور علمبردار تھا اور ہے اور جسے حضور اکرم صلی اللہ علیہ و سلم کا ''خطبہ حجۃ الوداع'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جس میں بصراحت تمام اعلان کر دیا گیا تھا کہ کسی عرب کو عجم پر اور عجم کو عرب پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ، تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے پیدا ہوا تھا اور قرآن نے فیصلہ کر دیا کہ تم میں خدا کے نزدیک سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو سب سے زیادہ گناہ اور بدی سے بچتا ہے ۔

آج کہ اہلِ اسلام دیس دیس میں موجود ہیں مگر وہ جہاں بھی ہیں ان کا انداز ، مزاج ، رویہ ، آداب ، معاملات ، معیارِ خیروشر وہاں کے غیر مسلم معاشروں سے ممیز ہیں ۔ غیر مسلموں سے قرب مکانی ہے مگر وہ ان سے دور ہیں اور مسلمانوں سے بعد مکانی کے با وصف قریب ہیں ۔ ہم نے دیکھا ہے کہ یوگوسلاویہ کا مسلمان اہلِ پاکستان میں اس طرح رہتا ہے گویا اپنے ہی کنبے میں ہو ، حالانکہ خود یوگوسلاویہ میں وہیں کے مسیحیوں اور کمیونسٹوں میں اس کا دم گھٹتا ہے ۔ علامہ اقبال ہی کو لیں ، وہ برعظیم کے غیرمسلموں کے لیے اپنے عقیدے اور نظریے اور مزاج اور رویے کے باعث اجنبی ہیں لیکن افغانوں ، ایرانیوں ، ترکوں ، مصریوں وغیرہ سے قریب ہیں ۔ عبدالوہاب عزام مصر میں ہوں ، محمد عاکف ترکی میں ہوں ، ملک الشعرائے بہار ایران میں ہوں تو حضرت علامہ کے عزیز اور یگانے محسوب ہوں ، مگر ٹیگور اسی برعظیم میں ہونے کے با وصف دور ہوں ۔ حق یہ ہے کہ ایک طرف فاصلے میلوں سے ناپے جاتے ہیں اور دوسری طرف روحانی سفر ہیں جہاں فاصلے ہوتے ہی نہیں ۔ ع

بعدِ منزل نہ بود در سفر روحانی

اصل سبب یہ ہے کہ بقول کسے مسلمانوں کے لیے اسلام مذہب ہی نہیں وطن بھی ہے - یا بقول علامہ یوں کہہ لیجیے -

ع اسلام تیرا دیس ہے تو مصطفوی ؐ

گویا مسلمان جہاں بیٹھ جائے وہیں اس کا وطن ، وہ خدا کا اور خدا کی خدائی اس کی ، اور جیسا کہ پہلے بیان میں کیا گیا ہے مسلمان پردیسی بھی اور ہردیسی بھی - پردیسی ان معنوں میں کہ خاک سے پیوند نہیں رکھتا ، لہٰذا کسی بھی وطن میں وہاں کے وہ خصائل و عادات قبول نہیں کرتا جو اسلام سے متصادم ہوں - ہردیسی یوں کہ کسی دیس میں بھی خود کو اجنبی نہیں جانتا - اس کا خدا ہر دیس کا مالک ہے اور وہ اس کے ساتھ ہے - وھو معکم این ما کنتم[1] - چنانچہ ڈاکٹر زکی علی (ترکی) کہتے ہیں کہ مغربی طرز اپنا کر بھی مسلمان بنیادی طور پر "اسلامی" ہی رہے ہیں اور رہیں گے بھی ، انہوں نے کبھی نہیں چاہا کہ مغرب میں مدغم ہو جائیں[2] - اسی بات کو مارس گاڈفرائے دی ممبنیز (Maurice Gaudfroy De Mumbnes) نے دہرایا ہے - اس کے کلمات ہمارے لیے حوصلہ افزا ہیں :

"اگرچہ باختلاف زمان و مکاں مسلمان اقوام میں تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں مگر ان کے مشترک اعمال و رسوم ، اور افعال و آداب نے انہیں بدستور حیاتِ تازہ دی ہوئی ہے -"[3]

اسی امر کے باب میں ڈی ممبنیز نے یہ بھی لکھا ہے کہ مسلمان معاشروں میں گو دولت کی وجہ سے یا منصب کے باعث طبقات پیدا ہو گئے ہیں ، اس کے باوصف برابری اور مساوات کا احساس موجود

۱- قرآن کریم - سورہ ۵۷ ، آیت ۴ -

2. Islam in the World, p. 396.

3. Muslim Institutions, p. 199.

رہتا ہے جو بڑے حیرتناک انداز میں ان کے مشترک رویے اور آہنگ میں جلوہ گر ہوتا ہے۔[1]

بقول علامہ یہ کیفیت اس طرح ہے :

چیست ملت اے کہ گوئی لا الٰہ ؟
با ہزاراں چشم بودن یک نگہ !

اہل حق را حجت و دعویٰ یکے است،
'خیمہ ہائے ما جدا دلہا یکے است'![2]

جس قدر زیادہ غور کریں اسی قدر کھل کر یہ بات سامنے آتی ہے کہ مسلم ملت از روئے جذبہ و فکر کبھی منقسم نہیں ہوئی - مسلمان خواہ کہیں بھی ہوں ان کے دل وحدت کے جذبے سے کبھی خالی نہیں ہوئے - ظاہر بین نظریں تو یہی کچھ دیکھتی ہیں کہ بنو امیہ کے خاتمے کے جلد ہی بعد مسلمانوں کا اتحاد ختم ہو گیا ، گویا وہ سیاسی اتحاد ہی کو حقیقی اتحاد جانتے ہیں - سیاسی اتحاد بھی قوت ہے ، برکت ہے اور بہت بڑی حقیقت ہے مگر روحانی اتحاد بھی ایک بھرپور حقیقت ہے - یہ ٹھیک ہے کہ بنو عباس کی خلافت کے وجود میں آنے سے کوئی چھ سال بعد ۱۳۸ھ میں اندلس (ہسپانیہ) کی حکومت خود مختار ہو گئی اور اس طرح مرکزی خلافت کے خلاف بغاوت جلوہ گر ہو پڑی - اندلس کے بعد شمالی افریقہ میں ادریسی اور پھر غالبی ، فاطمی ، موحدی و مرابطی یکے بعد دیگرے خلافتیں ابھرتی اور ڈوبتی رہیں - مشرقی محروسہ علاقوں میں بھی یہی ہوا - مقامی گورنر آہستہ آہستہ آزاد ہوتے گئے اور طاہریہ ، سامانیہ ، غزنویہ ، سلجوقیہ ، ایوبیہ ، صفویہ ، مغلیہ ، عثمانیہ وغیرہ سلطنتیں نمودار ہوئیں مگر دیکھا جائے تو یہ سلطنتیں اور حکومتیں ایک ہی برادری

---

1. Muslim Institutions, p. 159.

۲- جاوید نامہ ، ص ۱۹۲/۷۸۰ -

کی انتظامی تقسیم کا مظہر تھیں۔ ملت کبھی تقسیم نہیں ہوئی اور اس لیے کبھی تقسیم نہیں ہوئی کہ اسلام نے ان کی زندگی کے پورے ڈھانچے کو اس طرح متاثر کیا کہ وہ جہاں کہیں بھی تھے یک رنگ و یک آہنگ رہے۔ اندلسی مسلمان مرکز خلافت سے کٹ کر بھی یوروپ کی جانب کبھی نہ دیکھ سکے۔ ان کے ادبی، تمدنی، دینی اور روحانی روابط بہرحال شرق اسلام ہی سے وابستہ رہے۔ حکمرانوں نے باہم جدائی اختیار کر لی مگر افراد اُمت کو اس سے کیا۔ اس ضمن میں ڈبلیو سی سمتھ کا قول دلچسپی سے خالی نہیں۔ وہ کہتے ہیں:

"زندگی کے تقریباً ہر شعبے کو خواہ وہ کسی بھی موضوع سے متعلق تھا اسلامی رنگ میں رنگ دیا گیا تھا اور یہی وہ اسلامی ڈھانچہ تھا جس نے اسلامی معاشرے کو ہم جہتی بھی عطا کی اور زور اور ولولہ بھی۔ اس وحدت آموز قوت (توحیدی قوت) کا مرکز وہ دینی ضابطہ و آئین تھا جو اپنے طاقت ور اور صریح ولولے کے جلو میں ہر بات کو نظم و ترتیب سے نواز رہا تھا۔ عبادات سے لے کر حقوق ملکیت تک سب معاملات اسی کے زیر اثر تھے۔ اسلامی آئین (فقہ) نے مسلمان معاشرے کو قرطبہ (ہسپانیہ) سے لے کر ملتان تک وحدت سے نواز رکھا تھا۔ یہی نہیں بلکہ اس نے مسلمان فرد کو بھی (خود اس کی ذات میں) وحدت سے نواز رکھا تھا، اس لیے کہ اس کی ساری زندگی کو اس پاکیزہ سانچے نے عملاً منضبط اور منظم کر کے ایک بامعنی اور بھرپور کل بنا دیا تھا۔"[1]

علامہ اقبال اس کیفیت کو یوں بیان کرتے ہیں:

ملت از یک رنگیٔ دلہا ستے روشن از یک جلوہ ایں سینا ستے
قوم را اندیشہ ہا باید یکے در ضمیرش مدعا باید یکے[2]

---

1. Islam in Modern History, (First Edition, Paperback), p. 37.

۲- اسرار و رموز، ص ۹۲/۹۲ -

مدعاے ما ، مآلِ ما یکے ست   طرز و اندازِ خیالِ ما یکے ست[1]

اگر اسلام دلوں میں راسخ نہ ہو گیا ہوتا تو یہ صورتِ حال پیدا نہ ہوتی ۔ محض قولی اسلام زیادہ دیر تک مختلف احوال و مواقع میں مسلمانوں کو ایک زندہ حقیقت کے بطور باقی نہ رکھ سکتا ۔ بقول سمتھ :

''اسلام مسلمانوں کے لیے ایک مجرد نظریہ نہیں بلکہ ایک ایسا نظریہ ہے جو عمل پر اثر انداز ہے ۔''

یعنی عقیدے نے عمل بن کر مسلمانوں کو غیر مسلموں کے مقابل منفرد حیثیت دے دی اور وہ ''انفرادیت'' ہر جگہ کسی ''سخن آشنا'' کی منتظر تھی، للہذا مسلمان مسلمان کی طرف ایک جذبۂ بے اختیار کے ساتھ کھنچا چلا جاتا ہے ۔ گب نے لکھا ہے :

''اسلامی فقہ نے مسلمانوں کے مخصوص ذوقِ وحدت کو عملی قوتِ اظہار دے دی ہے ۔ اگرچہ فقہی مکاتب تفاصیل کے ضمن میں باہم مختلف بھی رہے مگر وہ اساسی امور میں یکساں تھے ۔ قرونِ وسطیٰ کے اسلامی معاشروں میں مقاصد و نظریات اور آدابِ حیات کی جو نمایاں ہم آہنگی نظر آتی ہے وہ فقہ اسلامی ہی کی کارفرمائی کا نتیجہ تھی ۔''[2]

اس یک جہتی کے کچھ خارجی وسائل بھی تھے ۔ ایک وسیلہ جو سب سے بڑا وسلیہ تھا ، وہ دین کا اہم رکن بھی ہے ، وہ ہے فریضۂ حج ۔ حج نے چودہ سو سال مسلمانوں کو درسِ اخوت و مساوات دیا ، خواہ وہ کسی بھی علاقے میں تھے ، خواہ وہ کوئی بھی زبان بولتے تھے، خواہ وہ کسی بھی نسل سے تعلق رکھتے تھے —

۱۔ اسرار و رموز ، ص ۹۳/۹۳ ۔

2. Muhammedanism (Second Edition : 1961, London).

امیر تھے یا غریب ، ادیب تھے یا شاعر ، فقیہہ تھے یا صوفی ، زاہد تھے یا مجاہد ، جب احرام باندھ لیتے تھے تو ایک ہو جاتے تھے ۔ زبانِ محبت ایک دوسرے کی ترجمانی کرتی تھی ، توحید و رسالت پر ایمان ہم نظری و ہم فکری بخشتا تھا ، عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم انہیں ایک مضبوط قلبی رابطہ عطا کر دیتا تھا ، تا حال یہی حال — کوئی غیر مسلم بھی اگر ذرا توجہ سے دیکھے تو محسوس کرے گا کہ حج دنیا میں سب سے بڑی بین الاقوامی نمائش اور منڈی یا سب سے بڑا بین الاقوامی میلہ ہے جو صدیوں سے قائم ہے ۔ کسی اور قوم کو حج کی سی کوئی نعمت میسر نہیں جو دنیا بھر سے مختلف اقوام کے افراد کو یکجا ہی نہ کرے یکدل بھی کرے ۔ حق یہ ہے کہ کسی قوم کو بیت الحرام کا سا زندہ مرکز میسر نہیں ۔

جب جنگ عظیم اول کے بعد ”جمعیتِ اقوام“ بنی تو گویا عالمِ اسلام سے باہر پہلی بار ایک بین الانسانی ، منصہ (پلیٹ فارم) وجود میں آیا مگر وہاں کوئی خلوصِ عقیدہ کارفرما نہ تھا ، وہاں آدم پیشِ نظر نہ تھا ، وہاں قومی ، نسلی ، وطنی خود غرضیاں کار فرما تھیں ۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جلد ہی وہ جمعیت اپنے ارکان کی خود کامی کی بدولت نذرِ پریشانی ہو گئی ۔ یوروپی اقوام کا مزاج مادہ پرستانہ ہے ؛ وہ دھرتی پوجا کے مریض خاک سے بلند ہو ہی نہ سکے ، چنانچہ جغرافیائی حدود میں مقید رہے اور انہی حدود کی پیدا کردہ عصبیتوں کا شکار ہو گئے ۔ ہر قوم نے اپنے وطن کی نسبت سے دوسری ہر قوم کو غیر جانا لہذا وہ اکٹھے بھی ہوئے تو منافقانہ ، ان کا اتحاد ان کے انشقاق کا ظاہری پردہ عیاری تھا ۔ چنانچہ علامہ اقبال نے جنیوا میں قائم ہونے والی ”محفلِ منافقت“ کو خطاب کر کے فرمایا :

اس دور میں اقوام کی صحت بھی ہوئی عام
پوشیدہ نگاہوں سے رہی وحدتِ آدم !

تفریقِ ملل حکمتِ افرنگ کا مقصود
اسلام کا مقصود فقط ملتِ آدم!

مکے نے دیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام
جمعیتِ اقوام کہ جمعیتِ آدم؟[1]

جمعیتِ اقوام پر ڈاکٹر زکی صاحب نے بھی علامہ اقبال ہی کی طرح تبصرہ کیا - فرق صرف یہ ہے کہ علامہ نے شعر کو ذریعۂ اظہار بنایا ہے اور ڈاکٹر زکی نے نثر کو - ڈاکٹر صاحب کا بیان یہ ہے :

"جمعیت اقوام کے صدر مقام جنیوا میں چھوٹی طاقتوں اور بڑی طاقتوں کا اجتماع ہے مگر مکہ میں ایک ہی جماعت ہے - جنیوا میں حکومتوں کے نمائندے ہیں مگر مکہ میں قوموں کے نمائندے ہیں - جنیوا میں تفاریق اور تعصبات ہیں مگر مکہ میں مساوات ہے - جنیوا میں میثاق و پیمان کے باب میں زبانی جمع خرچ ہے مگر مکہ میں احکامِ قرآن کے حضور متقیانہ اطاعت ہے - جنیوا میں متحارب مقاصد ہیں، حسد ہے اور منفعت کی خاطر خود غرضانہ مسابقت ہے مگر مکہ میں برادری اور اخوت کی روح کارفرما ہے اور بے پایاں عشقِ الٰہی کا دور دورہ ہے - مغرب کے قائدین و مدبرین کو محمد مصطفیٰؐ سے آگاہی حاصل کرنی چاہیے، فائدے میں رہیں گے اور جنیوا کو مکہ سے گراں بہا عملی سبق سیکھنا چاہیے - اسی طرح جمعیتِ اقوام کے مصلحین کے لیے بہتر ہوگا کہ قرآن سے مشورہ کر لیا کریں -"[2]

حق یہ ہے کہ جو تبصرہ اور شکوہ جمعیتِ اقوام کے باب میں بجا تھا وہ آج کی "اقوام متحدہ" پر صادق آتا ہے - لاکھوں دلوں

۱- ضرب کلیم، ص ۵۲، ۵۱۹/۵۸، ۵۷ -

2. Islam in the World, p. 391.

میں وہ جذبۂ ہمدردی و یگانگت جو حج پیدا کرتا ہے "اقوامِ متحدہ" سے اس کا عشر عشیر بھی نہیں ہو سکتا ، اس لیے کہ اقوامِ متحدہ میں تقویٰ ، خلوص ، وفا ، حق پرستی ، انصاف وغیرہ اصول کارفرما نہیں۔ وہاں بالعموم شماریات مغالطہ آمیز ہیں اور غلط ، ہدایات غلط ، احکام غلط ، اس لیے کہ ہر فیصلے کے پیچھے فیصلہ کنندگان کی مخصوص مصلحتیں عمل پیرا ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اقوامِ متحدہ بڑی طاقتوں کا اکھاڑہ ہے جو چھوٹی طاقتوں کی سیاسی اور فکری اکھاڑ پچھاڑ کرتی رہتی ہے۔ اری ٹیریا کے مسلمان حبشہ کی مسیحی شہنشاہی کے حوالے ہو جائیں ، روس بھارت کو شہ دے اور پاکستان دو لخت ہو جائے ، جنوبی افریقہ کی اصل آبادی مٹھی بھر لوگوں کے عنصر پرست استبداد میں مبتلا رہے و علیٰ ہذالقیاس ، کوئی پروا نہیں مگر جہاں کسی بڑی طاقت کی مصلحت آڑے آئے وہاں اقوامِ متحدہ میں حرکت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ ادارہ بظاہر دنیا کا اہم ترین بین الاقوامی ادارہ ہے مگر یہ ادارہ اولادِ آدم کو مثبت قدریں عطا نہ کر سکا۔ جھوٹ کو سچ کر دکھانا اور سچ کو جھوٹ ، ظالم کو مظلوم ثابت کر دینا اور مظلوم کو ظالم، مادی مفاد کو انسانی و اخلاقی قدروں پر ترجیح دینا ، وہ درس ہیں جو معاصر عالمِ انسانیت کو احترامِ آدمیت کے تصور ہی سے محروم کر دیتے ہیں۔ اقوامِ متحدہ جیسے اہم ادارے کو ، جس کی طرف دنیا کے ہر ملک کی آبادی دیکھتی ہے ، اپنے عمل سے اولادِ آدم کی اخلاقی تربیت کرنا چاہیے تھی مگر عملاً جو کچھ ہوا وہ برعکس ہوا۔ اس کے مقابل مکہ کا بین الاقوامی اور بین الانسانی اجتماع خاص حدود کے اندر دل گدازی ، شرافت ، ہمدردی ، محبت ، مساوات ، انکسار ، فیاضی ، ایثار ، استغنا اور حق پرستی و جرأت کا درس دیتا رہا اور ہر سال لاکھوں افراد ایک نئی معنویت سے مالامال ہوتے رہے ، تاہم حج کے ادارے سے بھرپور

انداز میں اخوت آموز اور وحدت افروز فائدے اس طرح حاصل نہیں کیے جا رہے ہیں جس طرح ممکن تھا اور ہے ، تاہم یہ ادارہ لاکھوں آدمیوں کی ذہنی و روحانی ، فکری و اخلاقی تربیت میں یقیناً مددگار ہے اور لاکھوں آدمیوں میں جو مختلف علاقوں ، نسلوں ، زبانوں اور رنگوں کے مالک ہیں روحانی یگانگت پیدا کرتا ہے ۔ اقوام متحدہ اس برکت سے محروم ہے ۔ اقوام متحدہ پر یوروپی نمائشی مگر مادہ پرست تہذیب مسلط ہے جس کا کوئی معیارِ اخلاق نہیں ، جس کی اقدار کو ثبات نہیں ، اس لیے کہ وہ قدریں کسی مستقل اصول پر استوار نہیں ۔ حضرت علامہ نے کیا خوب فرمایا تھا :

عرب کے سوز میں سازِ عجم ہے　　حرم کا رازِ توحیدِ اُمم ہے
تہی وحدت سے ہے اندیشۂ غرب　　کہ تہذیبِ فرنگی بے حرم ہے !۱

حج کا اجتماع علمی ، ثقافتی اور تجارتی اعتبار سے بھی اہم تھا ۔ جب دور دراز کے ممالک کے مابین ڈاک وغیرہ کا اہتمام نہ تھا ، اس وقت حج کے قافلے سارے عالم کو علمی ، ادبی اور ثقافتی رو سے بھی آگاہ رکھتے تھے ۔ نئی کتابیں ، نئی مصنوعات ، پارچات کے لیے نئے طراز ، ضرورت کی دیگر اشیا کے نوادرات اور ان کے ضمن میں اطلاعات وغیرہ مکہ میں جمع ہو جاتیں اور وہاں سے ہر اسلامی ملک تک رسائی حاصل کر لیتی تھیں ۔ گویا حج ایک دینی فریضہ ہی نہ تھا اسے تو عالمِ اسلام کی علمی ، ادبی ، ثقافتی ، تجارتی اور صنعتی بین الاقوامی نمائش کی حیثیت بھی میسر تھی ۔ سپین کا مسلمان آگاہ رہتا تھا کہ بخارا و سمرقند کے علماء ، ادبا ، فقہا اور اہلِ صنعت و حرفت کیا کر رہے ہیں ، نیشا پور والے باخبر رہتے تھے کہ ٹمبکٹو کے مسلمان کس حال میں ہیں ۔ اس طرح حرم کی برکت سے ملت مربوط رہتی تھی ۔ علاقائی سربراہوں کی باہمی چپقلش ملت کے اساسی

۱۔ بال جبریل ، ص ۸۲/۳۷۴ ۔

اتحاد کو کم ہی متاثر کرتی تھی -

حج کا ادارہ ملتِ اسلامیہ کی وحدت کا باعث تو تھا ہی ، ملت اسلامیہ کو وسعتِ نظر عطا کرنے ، مختلف غیر مسلم اقوام کے ساتھ راہ و رسم پیدا کرنے ، مختلف علاقوں کے تمدنی فکری اور جغرافیائی ماحول سے آگاہی حاصل کرنے میں بھی کتنا بڑا مددگار تھا - عرب سے باہر کا ہر وہ مسلمان گویا ایک سیاح کی حیثیت بھی رکھتا تھا جو حج کی نیت لے کر گھر سے نکلتا تھا - چنانچہ ابن بطوطہ اور ابن جبیر سے لے کر حضرت سعدی تک سب حاجی - ذرا اس دور کے رسل و رسائل کے پیش نظر قافلہ ہائے حج کا تصور کیجیے جو چار دانگ عالم سے سینکڑوں ہزاروں کوس کی منزلیں مارتے چلے آ رہے ہیں - بعض وہ ہیں جن کو چھ ماہ آتے لگے اور چھ ماہ جاتے - گویا سال بھر آنے اور جانے والوں کا تانتا بندھا رہتا اور دنیا کے کرے میں ایک حرکت اور ہلچل سی بپا رہتی - حج کی فرضیت نے کہاں کہاں کے آدم کو کہاں کہاں کے آدم سے ملنے کے مواقع بہم پہنچائے اور انہیں ایک دوسرے کو پہچاننے کے قابل بنایا - اگر غیر مسلم اولادِ آدم اسلام کے اس ادارے کی اہمیت کو نہیں سمجھتی تو کم از کم مسلمانوں کو اس کی اہمیت سے آگاہ ہو کر اس سے مزید مفید کام لینا چاہیے - اللہ نے بیت الحرام کا مرکز عطا کر کے مسلمان امت پر کتنا عظیم احسان کیا ہے - اس لطیف رمز کو کون سمجھے ، بقول حضرت علامہ اقبال :

میانِ ما و بیت اللہ رمزیست
کہ جبریلِ امیں را ہم خبر نیست !۱

آج بھی عالمِ اسلام کی باہمی محبت کی استواری اور پائداری میں

۱- ارمغانِ حجاز ، ص ۱۰۳/۹۸۶ -

حرم اسی طرح مہربان ہے - علامہ اقبال کے بقول پورا عالمِ اسلام ایک دائرہ ہے اور کعبہ اس دائرے کا مرکز ہے - یہ وہ روحانی مرکز ہے کہ ملتِ اسلامیہ کو ربط و نظام کی دولت سے بھی مالا مال کرتا ہے اور اس کے ایمان و ایقان کو بھی استحکام بخشتا ہے، اشتیاق بھی عطا کرتا ہے اور تسکین بھی دیتا ہے، بے تابی سے بھی نوازتا ہے اور تاب سے بھی نوازتا ہے - عالمِ اسلام جسد و پیکر ہے اور کعبہ جان و دل ہے، پھر ملت ہمدل اور ہمدم کیوں نہ ہو، یہ نعمت کسی دوسری ملت کو کہاں میسر ہے؟ — ہاں مگر کوئی دوسرا کعبہ ہے کہاں جو اقوام کو ملت بنا دیتا؟ اس امر کی ترجمانی بھی علامہ ہی کی زبان سے لطف دیتی ہے -

حلقہ را مرکز چو جاں در پیکر است
خطِ او در نقطۂ او مضمر است

قوم را ربط و نظام از مرکزے
روزگارش را دوام از مرکزے

راز دار و راز ما بیت الحرم
سوز ما ہم ساز ما بیت الحرم[1]

ملت کو ہمدمی عطا کرنے کے باب میں عربی زبان نے بھی بڑا کام کیا - تقریباً چار سو سال عربی تمام اسلامی دنیا کی مشترک رسمی زبان تھی - خود محمود غزنوی نے جب لاہور کا الحاق کیا تو جو پہلے اسلامی دفاتر مغربی پاکستان میں قائم ہوئے ان میں سارا کام عربی زبان کی معرفت ہوتا تھا - آج بھی اسلامی دنیا کے تقریباً نصف ممالک میں عربی کو سرکاری زبان کی حیثیت حاصل ہے - جن ممالک میں عربی زبان مستقلاً رسمی اور ادبی و علمی زبان بن کے باقی نہ رہ سکی وہاں کی

۱- اسرار و رموز، ص ۱۳۵/۱۳۵ -

بھی زبان کا رسم الخط بدل دیا ، ساتھ ہی ہر غیر عربی اسلامی زبان کو اتنے مفرد و مرکب کلمات دے دیے اور خصوصاً اتنی علمی اصطلاحات بخش دیں کہ مسلمان قومیں ایک دوسری کی زبان پڑھے اور جانے بغیر بھی مشترک عربی کلمات و اصطلاحات کی بدولت ایک دوسری کا مفہوم سمجھ لیتی ہیں ۔ فقہی ، طبی ، فلسفی ، جغرافیائی ، فلکیاتی غرض جملہ علوم کی قدیم اصطلاحات عربی زبان کی بدولت سارے عالمِ اسلام میں مشترک ہیں — اور افہام و تفہیم میں مددگار ۔

پردۂ ماضی کے پیچھے جھانکیں تو سیاسی طور پر بٹا ہوا عالمِ اسلام عملاً ایک ہی وطن نظر آتا ہے ۔ مسلمانوں کے تجارتی قافلے سپین سے لے کو منگولیا تک اور مالی موریتانیا سے لے کر قسطنطنیہ تک رواں دواں رہتے تھے ۔ ان قافلوں میں عام دیگر مالِ تجارت کے علاوہ کتابیں بھی ہوتی تھیں ۔ تاجروں کے علاوہ عام مسافر بھی رفاقت اور حفاظت کی خاطر تجارتی قافلوں میں شامل ہو جاتے تھے ۔ ان مسافروں میں شاعر بھی ہوتے تھے ، ادیب بھی ، عابد بھی ، فقیہہ بھی ، عالم بھی ، محقق بھی ۔ بڑے شہروں اور بستیوں کے قریب قافلے کئی کئی روز رکے رہتے تھے ۔ مال کا لین دین بھی ہوتا تھا اور اہلِ علم کے تبادلہ ہائے ملاقات بھی عمل میں آتے تھے ۔ کاتب راستے سے کتابیں نقل کرکے لے جاتے تھے یا راستے کے کاتب مسافروں کی کتب نقل کرکے رکھ لیتے تھے ۔ قافلے میں حلقہ ہائے درس قائم ہو جاتے تھے، یا قافلے والے شائقینِ علم بستی یا شہر کے کسی نامور عالم کے حلقۂ درس میں جا بیٹھتے تھے ۔ گویا مسلمانوں کے تجارتی قافلے چلتی پھرتی ادبی ، ثقافتی اور نشریاتی ایجنسیاں تھیں ۔ پھر یہ کہ قافلے والے دیس دیس کی خبریں سناتے تھے ، راستے کے حکام و سلاطین قافلوں کے اکابر کو بطور خاص بلواتے تھے ، ان کی تواضع کرتے تھے اور ان سے بصد شوق ان ممالک کی خبریں حاصل کرتے تھے جہاں سے قافلے چلے تھے یا گزر کر آئے تھے ۔

مسلمانوں کے مدارس مشترک تھے ۔ کوئی مسلمان خواہ کسی بھی ملک کا ہو جس بھی مسلمان ملک میں چاہتا مفت تعلیم پا سکتا تھا ۔ اہلِ علم ، صوفیہ اور دراویش ہر دم گردش میں رہتے تھے۔ امام غزالی کو لیجیے ، نیشاپور میں پیدا ہوئے ، بغداد میں تعلیم پائی ، دمشق میں اعتکاف فرمایا ۔ ان کی کتابوں نے ابن تومرت کے مراکش میں مخالفت کی آگ بھڑکا دی ، ان کے فلسفے نے اندلس کے فیلسوف ابن ماجہ اور ابن طفیل پر اثر ڈالا ۔ حضرت سعدی کی سیاحت کا منظر گلستان میں ملاحظہ کیجیے — میں گلستان کو ملت کا جغرافیہ قرار دیتا ہوں — حضرت سعدی ایک جانب المغرب (یعنی مصر سے مغرب کی جانب کے شمالی افریقہ) کے کسی بدمزاج تند خو استاد کی بات کرتے ہیں تو دوسری طرف کاشغر کی جامع مسجد میں عربی صرف ونحو پڑھنے والے کسی خوب رو شاگرد کی کیفیت بیان کرتے ہیں ۔ اور سعدی کا دور طوائف الملوکی کا دور تھا ، ہر دوسرے تیسرے شہر سے نئی بادشاہت شروع ہو جاتی تھی مگر گلستان میں نیل کے ساحل کے پرے سے لے کر کاشغر تک کہیں تہذیبی منظر اور اخلاق و ادبی انداز بدلتا نظر نہیں آتا ۔ عالمِ اسلام سمندر کی طرح تھا اور مسلمان اس میں مچھلیوں کی طرح تیرتے پھرتے تھے ۔ اور مچھلیاں خلیجوں ، بحیروں اور بحروں کی سرحدیں نہیں جانتیں ۔ خلیج بنگال کہاں ختم ہوئی ، بحیرۂ عرب کہاں سے شروع ہوا ، بحرِ ہند کہاں ختم ہوا ، بحر الکاہل کا کہاں سے آغاز ہوا ۔ عالم اسلام کے علاقائی ، سیاسی حاکم اور سلطان محض علاقائی افسر تھے — ”خیمے الگ الگ تھے ، دل ایک تھے ۔“

ع   خیمہ ہائے ما جدا دلہا یکیست

والی بات تھی ، کلمہ طیبہ پاسپورٹ تھا ۔ السلام علیکم ویزا تھا ۔ یہ کسی شاعر کی خیال آرائی نہیں ، یہ ٹھوس حقیقت ہے ، تاریخ گواہ ہے ۔

ہو قیدِ مقامی تو نتیجہ ہے تباہی   رہ بحر میں آزادِ وطن صورتِ ماہی[1]

مسلمانوں میں وطنیت کا تصور نہ تھا لہٰذا تصدیق نامۂ توطن جسے Domicile Certificate کہتے ہیں کوئی مفہوم نہ رکھتا تھا۔[2] اگر کوئی مسلمان ہوتا تھا تو جس بھی اسلامی سلطنت میں جاتا تھا حسبِ کمال مقام و منصب پاتا تھا۔ اگر فقیہہ ہے تو قاضی، اگر بہادر سپاہی ہے تو عساکر میں منصب، دانش و تدبر کے ساتھ انتظامی تجربہ بھی رکھتا ہے تو کسی علاقے کا گورنر یا وزیر، بس مسلمان ہونا شرط تھا، اول و آخر ایک ہی شرط۔ یہ کہ وہ کس وطن سے ہے، کس نسل سے ہے، اس کے آبا و اجداد کیا کام کرتے تھے، بہت کم پوچھا جاتا تھا۔ اس میں ابن بطوطہ کی مثال پیش کرتا ہوں۔ اس کے سفر نامے میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ وہ جس بھی اسلامی ملک میں پہنچا، یا وزیر بنا یا قاضی، اور بعض ملک میں قاضی القضاۃ۔ ایک سے زیادہ سلاطین نے بیٹی نکاح میں دی۔ ہندوستان میں آیا تو محمد تغلق نے قاضی مقرر کیا اور پھر اپنا سفیر بنا کر چین بھیج دیا۔ طنجۂ مراکش کا باشندہ، سلطانِ ہند کا سفیر؟ کہاں، چین میں، یہ کوئی واحد مثال نہیں، تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے، کوئی دوسری قوم ایسی مثال پیش نہیں کر سکتی۔

کوئی مسلمان ہیرو اور فاتح خواہ وہ کسی بھی علاقے اور نسل اور قوم سے تعلق رکھتا ہو، پورا عالمِ اسلام اس کی تکریم کرتا تھا۔ محمد بن قاسم ہو یا یوسف بن تاشفین، محمود غزنوی ہو یا

۱۔ بانگِ درا، ص ۱۶۰/۱۶۰۔

۲۔ مگر ہم نے پاکستان میں جسے اسلامی اخوت کا مظہر بنانا مقصود تھا، صوبوں ہی کے ضمن میں نہیں ضلعوں کے معاملے میں بھی ڈومی سائل قائم کر رکھا ہے اور اس طرح ہم ایک حصار کے اندر کی صفوں میں بھی انتشار پیدا کر رہے ہیں۔ "لشکریاں شکستہ صف" والی بات ہے۔

صلاح الدین ، عالمگیر تیموری ہو یا سلیمان عثمانی ، وہ پوری اُمت کے محترم ہیں ۔ مجھے یاد ہے کہ آج سے کوئی بیس برس قبل لائل پور میں ایک عرب دوست صالح السامرائی سے باتیں کر رہا تھا کہ شہنشاہ عالمگیر کا ذکر میری زبان پر آیا ۔ میں نے عالمگیر کے نام کے ساتھ ”رحمۃ اللہ علیہ“ نہیں کہا ، صالح السامرائی نے مجھے فوراً ٹوک دیا ، ”رحمۃ اللہ علیہ“ کہو، وہ تو سلطانِ صالح تھا ۔ غرض جس دور میں بھی ، اور جس شعبۂ حیات میں بھی کسی مسلمان نے سرفرازی حاصل کی اسے سارے عالمِ اسلام نے قدر کی نظر سے دیکھا ، احترام کیا ، داد دی ۔ دور کیوں جائیے آج ہی کی مثال لے لیجیے ۔ ایک شخص سیاہ فام ، امریکہ کا رہنے والا ، نام کلے ، باکسنگ کرتا تھا ، ہمیں کوئی پرواہ نہ تھی ، مگر جب وہ کلے کے بجائے محمد علی ہو گیا تو اس کی حیثیت ساری مسلم ملت کے ایک ہیرو کی سی ہو گئی ۔ جب وہ کوئی مقابلہ جیتتا ہے تو پوری اسلامی دنیا خوشیاں مناتی ہے اور اسے ہر ملک کے مسلمان تہنیت کے تار روانہ کرتے ہیں ۔ وہ فقط ایک بار ہارا ، اور لاہور میں ٹی وی پر اس میچ کا منظر دیکھنے والے ایک صاحب صدمے سے وہیں ڈھیر ہو گئے ، لیکن محمد علی سے جیت جانے والے مسیحی قوم کے فرد کی وہ حیثیت نہ تھی کہ اسے اس کے اپنے وطن کے باہر کے درجنوں معاشرے مبارک باد کے تار روانہ کریں اور اس لیے تار روانہ کریں کہ وہ اس کی فتح کو اپنی فتح جانتے ہیں ۔ عیسائی معاشرے ، عیسائی اقوام کے معاشرے ہیں ، ان میں ملت کا جذبہ موجود نہیں ، اسی وجہ سے بقول سمتھ صاحب ”تاریخِ اسلام کی طرح کی کوئی تاریخ عیسائیوں کو میسر نہیں کہ اسے تاریخِ مسیحیت کہہ سکیں ۔“[1]

یہ ہے وہ جذبہ اور کشش جس نے اسلام کو ایک حد تک تاحال ایک کنبہ بنایا ہوا ہے ۔ مسلمانوں کو تو جدائی کا احساس اس

---

1. Islam in Modern History, p. 30.

وقت ہوا جب مغربی اقوام نے ان کے علاقوں پر قبضہ کر لیا اور ان پر اپنا ویزا اور پاسپورٹ نافذ کر کے الگ الگ حدود میں قید کر دیا ۔ اس سے قبل مسلمانوں کو کبھی احساسِ جدائی ہوا ہی نہ تھا ، اس لیے کہ مسلمان سلاطین و حکام خواہ آپس میں ہزار بار لڑتے اُمت کو کوئی پرواہ نہ ہوتی تھی اور وہ ایک ہی رہتی تھی — یہ سلطان جیت گیا ، وہ سلطان ہار گیا — بس ، عوام کو اس معاملے سے اُس وقت تک کوئی خاص غرض نہ تھی جب تک جیتنے والا بھی مسلمان ہوتا ۔

آخر بشری تقاضا ہے ، کبھی مسلمان معاشرے بھی گمراہ ہو گئے ہوں گے یا پھر بھی ہو سکتے ہیں اور اپنی برادری کے خلاف بھڑکایا اور بہکایا بھی جا سکتا ہے ۔[1] اس سے پہلے بھی کبھی ایسا ضرور ہوا ہوگا مگر ایسی وحشت دائمی نہیں ہوتی ، ہوش جلد ہی لوٹ آتے ہیں ۔ مطلب یہ ہے کہ ایک مسلم وطن یا معاشرے کے عوام کسی دوسرے وطن یا معاشرے کے عوام کے کبھی محض اس لیے بد خواہ نہ تھے کہ وہ نسلاً یا وطناً یا لوناً ان سے جدا ہیں ۔ اُس تعصب کا ان میں شائبہ تک نہ تھا جو یوروپ کے خمیر میں گندھا ہوا ہے ۔ اہلِ فرانس مجموعاً اہلِ انگلستان کے دشمن رہے ہیں ، اٹلی والے جرمنوں سے یا انگریزوں سے ہم آہنگ نہ ہو سکے ، جرمن نیپولین پر اور انگریز بسمارک پر ناز نہ کر سکے ، کوئی سیزر انگریزوں کا ہیرو نہیں ہو سکتا مگر اس کے مقابل مسلمانوں کا مسلک جدا ہے اور وہ ہے بقول حضرت علامہ

نہ افغانیم و نے ترک و تتاریم — چمن زادیم و از یک شاخساریم
تمیزِ رنگ و بو بر ما حرام است — کہ ما پروردۂ یک نو بہاریم ![2]

۱- جیسا کہ مشرق پاکستان کی مسلم آبادی کا ایک حصہ گمراہ ہوا ۔
۲- پیام مشرق ، ص ۲۲۲/۵۲ ۔

آج کچھ وہ لوگ جو حقیقت سے آگاہ نہیں اور کچھ وہ جن کے دلوں میں بغض جاگزیں ہے ، یہ کہتے ہیں کہ مسلمان بڑے بے اصول اور بے ضمیر تھے ، ہر حملہ آور کے سامنے سر جھکا دیتے تھے ۔ بات یوں نہیں ، وہ حملہ آور اگر مسلمان ہوتا تو سر جھکا دیتے تھے ۔ ایک انتظامی سربراہ گیا ، دوسرا آ گیا ، وہ غم کیوں کرتے ، ہاں اگر کسی مسلمان کی جگہ کوئی غیر مسلم حملہ آور ہوتا یا قابض ہو جاتا تو بالعموم حسب ہمت اس کا مقابلہ کیا جاتا تھا ۔ بے بسی کے عالم میں ہجرت بھی کر لی جاتی تھی ورنہ اس سے خلاصی اور نجات کے لیے اللہ کے حضور دعا کی جاتی رہتی تھی ۔ مگر حملہ کرنے والے مسلمان نے کبھی محض اس بنا پر روگردانی نہ کی کہ وہ باہر سے آیا ہے یا وہ کسی غیر نسل سے ہے ۔ اگر مصر کا سربراہ حبشی النسل ہے تو کیا ، ترکی النسل ہے تو کیا ، اسی طرح اگر برعظیم پاک و ہند پر کوئی ترک قابض ہے تو کیا اور اگر کوئی پٹھان ہے تو کیا ، مگر جب غیروں کی چیرہ دستی شروع ہوئی تو مسلمانوں نے حسب ہمت مقابلہ کیا ۔ ٹھیک ہے خود غرض لوگ ہر قوم میں پائے جاتے ہیں اور وہ بھی جو فرض کر لیتے ہیں کہ فقط ہمارے دم سے معاشرے کی حیات و بقا ہے ۔ لہٰذا وہ دوسروں کو اس طرح شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں کہ ان کے وجود کو قوم یا معاشرے کے لیے زہر فرض کرنے لگتے ہیں ، اس طرح گویا زورِ اخلاص یا طغیانِ خوش فہمی یا غلط فہمی میں قوم کے قیمتی افراد باہم ٹکرا کر باعث نقصان و زوال بن جاتے ہیں اور اس امر سے بہرحال مفر نہیں ، اس لیے کہ

ع ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں

کچھ بھی ہو اسلام کے فیض سے تنگ نظر قومیت کی پذیرائی مسلمانوں میں نہ تھی اور نہ ہے ۔

محمد اسد اپنی کتاب Road to Mecca کے آغاز میں کچھ اس قسم کا تاثر دیتے ہیں کہ ''میں جب پاکستان کی طرف سے مقرر کردہ وفد کے رکن کی حیثیت سے یو - این - او میں پہنچا اور وہاں میں نے پاکستانی مسائل اور خصوصاً کشمیر کے باب میں جوش و خروش کا اظہار کیا تو یوروپ کے دیگر نمائندوں میں سے بعض کو بڑی حیرت ہوئی - وہ سمجھتے تھے کہ ایک یوروپی کو جو کسی مشرق مملکت کا ملازم ہے اپنا فرض تو بہرحال دیانت داری سے ادا کرنا چاہیے مگر میرا رویہ یہ نہیں - کچھ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے پاکستان کا مسئلہ میرا ذاتی اور جذباتی مسئلہ ہو - بات تو ٹھیک ہے ، وہ لوگ کیا جانیں کہ میرے لیے ایک مسلمان کی حیثیت سے ایک مسلمان ملک کے معاملات کو ذاتی معاملات جاننا بالکل طبعی امر تھا -''

آج جب کہ علاقائی قومیت کا دور دورہ ہے اور مسلمانوں کا بھی ایک طبقہ ہر ملک میں اس کے زہریلے اثر سے متاثر ہو رہا ہے ، اس کے باوصف یہ اساسی جذبہ اور جوش ختم نہیں ہوا - ڈی ممبنیز موجودہ دور کی مسلم اقوام کے بارے میں لکھتا ہے :

''آج کی اسلامی سوسائٹی بہت سی اقوام کے مجموعے کا نام ہے - ہر قوم اس کوشش میں ہے کہ مملکت کا درجہ پا لے مگر ساتھ ہی ساتھ خواہاں ہے کہ کوئی پیرایہ ایسا میسر آ جائے جس کے باعث عالم اسلام کے ساتھ روحانی اتحاد کو بحال رکھا جا سکے- غلطی سے صدیوں تک اس اتحاد سے سیاسی اتحاد مراد لیا جاتا رہا ہے ؛ وہ اتحاد جس کا سربراہ خلیفہ ہو ، جس کی ذات میں دنیوی قوت اور روحانی اقتدار دونوں جمع ہوں - - - - ہاں اس دور (دور خلافت) میں مسلمان ایک ہی قوم تھے اور اس قوم کے جملہ ادارے دینی روح سے سرشار تھے -''[1]

---

1. Muslim Institutions, p. 5.

مسلم اقوام کا یہ دینی اور روحانی رشتہ انہیں ایک لڑی میں پرو دیتا ہے اور ان کا مجموعی نام ملت بنتا ہے۔ حضرت علامہ نے مسلم اقوام کو ہمیشہ اسی نظر سے دیکھا اور اس ضمن میں اگر کوئی خطرہ تھا تو یہ کہ مبادا جدید نسل یوروپ کی اندھی نقالی میں یوروپ کے نظریۂ قومیت سے یوں متاثر ہو کہ اپنی روحانی اساس اتحاد مسمار کر بیٹھے۔ اس خوف کا ایک باعث بھی تھا۔ ظاہر ہے کہ یوروپی اقوام نے عالم اسلام کے مختلف حصوں پر یکے بعد دیگرے قبضہ کر لیا تھا اور ان پر اپنا اپنا پاسپورٹ مسلط کر کے انہیں ایک دوسرے سے ملتے رہنے سے روک دیا تھا۔ جب یہ کیفیت ہوئی تو مسلمانوں کو پہلی بار احساس ہوا کہ اگرچہ مسلمان ایک مرکزی خلافت یا سلطنت کا حصہ نہ رہے تھے اس کے باوصف جب تک وہ اپنے اپنے علاقوں میں آزاد تھے ایک دوسرے سے جدا نہ تھے، جدا تو آ کے غیروں نے کیا۔ اب خطرہ یہ تھا کہ مسلمان اقوام کو اپنے اپنے علاقوں میں الگ الگ جد و جہد کرنا پڑے گی کیونکہ تقریباً سب غلام ہیں۔ لہٰذا ایک علاقے کے مسلمان دوسرے علاقوں کے مسلمانوں کی کوئی امداد نہ کر سکیں گے۔ اپنی اپنی حدود میں رہ کر اپنے اپنے علاقوں کی آزادی کی جو جنگ ہوگی ایسا نہ ہو کہ اس کے باعث مسلمانوں کی حب وطن ایسا رنگ اختیار کر لے جیسا یوروپی اقوام کی حب وطن نے اختیار کر رکھا ہے۔

پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ یوروپی اقوام نے اپنے مقبوضات میں اپنے مخصوص انداز کو رواج دیا۔ خاص طور پر یہ کہ اپنی زبان نافذ کی اور وہاں کی اصلی زبان کو پس پشت ڈال دیا، اپنا اپنا مخصوص نصاب پڑھایا، اعلیٰ تعلیم اپنے یوروپی وطن میں اپنے اساتذہ سے اپنے اداروں میں دلائی۔ بعض یوروپی ممالک نے تو مقبوضہ علاقوں کی آبادی کے افراد پر یہ شرط بھی لگا دی کہ تعلیم وہی حاصل کرے گا جو مسیحیت قبول کر لے گا اور ظاہر ہے کہ فوجی اور سول اچھی ملازمت اسی کو ملنا تھی جو اپنے آقا کی زبان جانتا اور اس کا

ہم نظر و ہم عقیدہ ہوتا ۔ یوروپی حاکموں نے سوچا ، چلیے مسلمان ''نئی روشنی'' کے شوق میں مسیحی نہ ہوئے سہی مگر ان کے دینی نظریات کی اساس میں تزلزل واقع ہوگا ، پھر اگر وہ یوروپ والوں کا مقابلہ انہی کی منطق اور انہی کے دلائل سے کریں گے تو متاثر بھی ہوں گے ، مثلاً قوموں کے حق خود ارادیت کو اگر نعرۂ آزادی بنایا جائے تو اس کا نتیجہ علاقائی اور وطنی قومیت کے عقیدے کا رسوخ ہوگا ۔ مگر ساتھ ہی وہ مسلمان جو صاحب نظر تھے ، وہ یوروپ جا کر یہ بھی دیکھ آئے تھے کہ اگرچہ یوروپی اقوام کا دین ایک ہے ، تہذیب ایک ہے ، آداب و اخلاق کے معیار ایک ہیں ، اس کے باوصف وہ ایک دوسرے کے جانی دشمن ہیں ۔ فرانسیسی ، بلجیئن ، ولندیزی ، انگریز ، ہسپانوی ، روسی وغیرہ علاقائی قومیت کے باعث ایک دوسرے سے متنفر ہیں ۔ یہ چیز سوچنے والے مسلمان کو بھی متنبہ کر دیتی تھی کہ ''نیشنلزم'' کا نظریہ آدم کو آدم کا بیری بنا دیتا ہے ۔ پھر معاً یہ خیال آتا کہ اگر وطنی جذبات ابھار کر یوروپی استعماری قوت کا مقابلہ کرنے میں مدد مل سکتی ہے تو کوئی حرج نہیں ، اس ہتھیار کو استعمال کر لیا جائے ، بعد میں ازالہ کر لیا جائے گا ۔ گویا ''نیشنلزم'' کا توڑ نیشنلزم کو بنایا جا سکتا تھا اور استعمار کے خلاف جذبات کو ابھار کے غلاموں کو نادانستہ طور پر کمیونزم کے قریب لایا جا سکتا تھا ۔ ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' میں یوروپی استعمار کی شیطنت کا علاج مزدکیت بتایا گیا ہے اور پھر مزدکیت کو اسلام کے مقابل بے ثبات اور ناپائدار خاکبازی قرار دیا گیا ہے ۔ اس لیے کہ نہ وطنی قومیت نے اتحاد آدم کا درس دیا اور بنیادی انسانی قدروں کا احترام ملحوظ رکھا اور نہ کمیونزم نے ۔ کمیونزم نے مساوات شکم پر اتنا زور دیا کہ انسان کا روحانی پہلو دب گیا اور وہ انسانیت سے دور اور حیوانیت سے قریب ہوتا چلا گیا ۔ پیٹ کی ضرورت اولین ضرورت ہے ، اس میں ہر حیوان ، آدمی کا شریک و سہیم ہے ۔ اس سطح سے بلند ہونا گویا آدمیت کی

سطح پر پہنچنا ہے۔ مگر جب مادہ پرستی عمل اور ایمان بن جائے تو رفعتوں کی جانب پرواز مشکل ہو جاتی ہے۔ حیوانی سطح پر رہتے رہتے آخر آدمی یہ بھول جاتا ہے کہ وہ کبھی آدمی بھی تھا اور اس کے کچھ اصول اور قدریں بھی تھیں جن پر آدمیت استوار تھی اور حق یہ ہے کہ علامہ اقبال کو یہ خوش فہمی تھی کہ مسلمان کمیونزم قبول نہ کریں گے البتہ حالات کے تقاضا سے شاید وطنی قومیت کے نظریے کا شکار ہو جائیں۔ علامہ کے نزدیک یہ نظریۂ قومیت بھی ایک حیوانی اور وحشی نظریہ تھا۔ احترامِ آدم کا درس فقط اسلام ہی دے سکتا تھا اور دے سکتا ہے۔ سید نذیر نیازی صاحب نقل کرتے ہیں کہ میں نے کہا ''لندن ٹائمز نے لکھا ہے کہ عالمِ اسلام میں اس وقت نسلی تفریق کا غلبہ ہے''۔ یہ سن کر فرمایا ''تم یوروپ نہیں گئے، ورنہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے کہ ایک جرمن کو ایک انگریز سے باوجود اشتراک تہذیب و تمدن وہ تعلقِ خاطر نہیں جو ایک افغان کو ترک سے ہے اور باوجود عالمِ اسلام کے انحطاط اور اس امر کے کہ مسلمانوں کا رابطہ ایک دوسرے سے کٹ گیا ہے لیکن وہ ملتے ہیں تو بچھڑتے ہوئے بھائیوں کی طرح۔''[۱]

اور یہ عجیب خوشگوار حیرت کا مقام ہے کہ ہر اسلامی وطن کے اندر کوئی نہ کوئی ایسی تحریک جاری رہی جو مسلمانوں کو ان کے ماضی سے روگرداں ہونے سے روکتی رہی، جو انہیں مایوس ہونے سے بچاتی اور روشن مستقبل کی امیدوں سے سرمایہ دار کرتی رہی۔ مہدی سوڈانی کی تحریک سوڈان میں، سنوسی کی تحریک لیبیا میں، شرکت الاسلام، دارالاسلام اور محمدیہ تحریک انڈونیشیا میں، کاشانی کی تحریک ایران میں، جمال الدین افغانی کی بین الاسلامیت کی

۱۔ اقبال کے حضور، ص ۱۵۰۔

تحریک مصر ، ہند ، ترکی اور ایران میں ، شیخ محمد عبدہ' کی تحریک مصر میں ، رشید رضا کی تحریک شام میں — اور ہندوستان میں شاہ ولی اللہ سے لے کر علامہ اقبال تک جو سلسلۂ تعلیم و تبلیغ جاری رہا وہ ظاہر ہے — غرض ہر اسلامی وطن میں علمبرداران اسلام موجود تھے جو بقدرِ ہمت مسلمانوں کی معنوی قوت کو سہارا دیتے رہے - نتیجہ یہ کہ مسلم اقوام نے یوروپی مادہ پرست تعلیم کے باوصف دینی اور روحانی اقدار کو تھامے رکھا ، لہٰذا وہ بالعموم ''دھرتی پوجا'' کا نظریہ قبول کر کے خاکباز نہ بن سکیں ورنہ اپنے شجر ملت سے کٹ کر رہ جاتیں اور پھر اپنی ہم اصل شاخوں کو پہنچاننے کے لائق نہ رہتیں -

سمتھ نے لکھا ہے کہ مسلمانوں کے یہاں اسلام کچھ اس طرح جزو جاں ہے کہ ان تک پہنچنے والا کوئی نظریہ بھی ایسا نہیں رہتا جیسا کہ باہر سے آیا تھا - مسلمان اسے اسلامی رنگ میں رنگ دیتے ہیں - لبرلزم (Liberalism) ان کے یہاں جا کے معین اسلامی مقاصد کا علمبرار بن جاتا ہے -[1] لہٰذا عرب قومیت اور اسلام ایک ہی چیز ہے - ترکوں کا نیشنلزم بھی یہی ہے کہ فقط ترکوں کو مسلمان کہا جاتا ہے جو تھوڑے بہت یہودی اور عیسائی وہاں آباد ہیں انہیں ترک شمار نہیں کیا جاتا - گویا ترکوں کا نیشنلزم بھی دیگر ہر مسلمان ملک کے نیشنلزم کی طرح مخصوص اسلامی نیشنلزم ہے[2] - یہ ہے وہ جذبہ بین الاسلامیت جو 'پین اسلامزم' کہلاتا ہے اور جس کے بانی جمال الدین افغانی قرار دیے جاتے ہیں جنھوں نے ۱۸۵۷ء میں مکہ میں ایک انجمن کی بنیاد رکھی تھی جس کا نام ''اُم القریٰ'' تھا اور جس کا مقصد مسلمانوں میں وحدت ملی کا شعور بیدار رکھنا اور انہیں یوروپی نظریۂ قومیت سے محفوظ رکھنا،

---

1. Islam in Modern History, p. 75.
2. ,, ,, ,, p. 85.

نیز ان کی آزادی و حریت میں مددگار ہونا تھا ۔ یہ "پین اسلامزم" بقول سمتھ توحیدی جذبہ ہے اور حق یہ ہے کہ اتحادِ عالمِ اسلام جذبے ہی کی وحدت کا نام ہے ۔[1] خواہ یہ بات سمتھ صاحب نے کسی بھی جذبے کے تحت کہی ہو مسلم اقوام کے تصورِ ملت کی ترجمانی ضرور کرتی ہے ، بقول حضرت علامہ

ملتِ ما را اساسِ دیگر است
ایں اساس اندر دلِ ما مضمر است[2]

مزید وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں

چیست دیں برخاستن ازروئے خاک
تا ز خود آگاہ گردد جانِ پاک !

می نگنجد آنکہ گفت اللہ ہُو
در حدودِ ایں نظامِ چار سُو ![3]

غیروں کو سمتھ صاحب سمیت تاحال یہ احساس ہے کہ مسلمان بدستور مسلمان ہے ، اس کا عقیدہ ڈول نہیں سکا مگر ہر درد مند صاحب نظر مسلمان کی طرح علامہ اقبال کو یہ خوف بہرحال اور ہر دم لاحق رہتا تھا کہ یوروپی تعلیمات کے زیرِ اثر مسلمانوں کی نگاہ کے زاویے کہیں بدل نہ جائیں ۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ غلامی و محکومی کی بدولت ایک گروہ کی نظر میں جستجو اور دلوں میں ذوقِ طلب کا ولولہ کم ہوتا جا رہا ہے ۔ ایک گروہ یوروپی استعمار کے خلاف علاقائی قومیت کے جذبے کو ہتھیار بنانے پر تل رہا ہے ۔ برِ صغیر پاک و ہند میں انگریزی استعمار کا مقابلہ کرنے کی خاطر ایک گروہ متحدہ

---

1. Islam in Modern History, p. 88.

۲- اسرار و رموز ، ص ۹۳/۹۳ -

۳- جاوید نامہ ، ص ۶۵۱، ۶۵۰/۶۳، ۶۱ -

قومیت کے نعرے سے متاثر ہو رہا ہے ۔ چنانچہ انہوں نے فریاد کی ۔

بڑھ کے خیبر سے ہے یہ معرکۂ دین و وطن
اس زمانے میں کوئی حیدرِ کرّار بھی ہے[1]

علامہ تو رنگ و نسل کی تمیز اور وطنیت کے جدید رجحان کو بت پرستی قرار دیتے اور آدم کشی جانتے تھے ۔ اس وحشی نظریے کا بھلا اسلام سے کیا واسطہ ، اسلام کا مفہوم تو اخوت اور مقصود وحدتِ آدم ہے ۔

فکرِ انساں بُت پرستے بُت گرے
ہر زماں در جستجوے پیکرے

باز طرحِ آزری انداخت است
تازه در پروردگارے ساخت است

کاید از خوں ریختن اندر طرب
نامِ او رنگ است وہم ملک و نسب

آدمیت کشتہ شُد چوں گوسفند
پیش پائے ایں بتِ نا ارجمند[2]

وطنیت کے اس زہرناک تصور کو اردو میں بایں الفاظ بیان کیا ہے ۔

اقوامِ جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے
تسخیر ہے مقصودِ تجارت تو اسی سے

خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے
کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے

۱- بالِ جبریل ، ص ۳۵۶/۶۴ -
۲- اسرار و رموز ۱۴۰/۱۴۰ -

اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے
قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے[1]

اس تصور قومیت کو جو وطن ، نسل اور رنگ کے امتیاز پر استوار ہے ، علامہ اقبال ''بت نا ارجمند'' قرار دے رہے ہیں - یہی وہ مشرکانہ اور مادہ پرستانہ تصور تھا جس کا سہارا لے کر بر صغیر پاک و ہند میں غیر مسلم اکثریت کے سربراہ اور قائدین چاہتے تھے کہ مسلمانوں کو ہندوؤں میں مدغم کر لیں ، چنانچہ علامہ کو اس خطرے کے پیش نظر ہر دم چوکنا رہنا پڑا - یوروپ کا پیدا کردہ یہ فتنہ یوں تو سارے عالم اسلام کے لیے ضرر رساں تھا مگر اس برعظیم کے کروڑوں مسلمانوں کے لیے جو غیر مسلموں کی حاوی اکثریت میں محصور تھے، اور بھی زیادہ خطرناک تھا - وہ غیر مسلم اکثریت بھی کون سی ، ہندو قوم کی اکثریت جو تنگ نظری اور تنگ دلی میں دنیا بھر کی اقوام میں نرالی قوم ہے ، جو خود قوم کی کسی بھی تعریف پر پوری نہیں اترتی ، ذاتوں اور طبقوں میں یوں بٹی ہوئی ہے کہ بقول ہیگل '' گروہوں کی بھیڑ بھاڑ تو ہے ، قوم نہیں - ''[2]

علامہ اقبال کے نزدیک یہ فتنہ انتہائی اندوہناک اور مہیب تھا - اگر مسلمانوں کو بروقت متنبہ نہ کیا جاتا اور اس شدید اور قریبی خطرۂ عظیم سے بخوبی آگاہ نہ کیا جاتا تو اس امر کا خوفناک امکان موجود تھا کہ مسلمان اپنے طبعی جذبۂ حریت پسندی کے باعث ہندو قوم کے دوش بدوش بلکہ آگے آگے انگریزی استعمار سے لڑتے لڑتے متحدہ قومیت کے نعرے کا زہر بھی بے خبری میں نوش کر جاتے - کانگریسی قیادت نے بڑی ہوشیاری اور فنکاری سے حب وطن اور متحدہ قومیت کی تبلیغ شروع کر دی تھی تا کہ ایک طرف

۱- بانگ درا ، ص ۱۶۱، ۱۶۰/۱۶۱، ۱۶۰ -

2. Philosophy of History, p. 168.

انگریز کو مسلمانوں کی مدد سے نیچا دکھایا جائے اور دوسری طرف اس نظریے کے زیرِ اثر مسلمان معاشرے کی جوئے خوش آب کو بھی ہندو اکثریت کے ایک ریگ زار میں دفن کر دیا جائے۔

حضرتِ علامہ کو یہ خدشہ تھا کہ نوجوان تعلیم یافتہ مسلمان جس کے سامنے یوروپی سیاسی اور تمدنی اصطلاحیں ہیں، جو قوم کو بھی نیشن کہتا ہے اور ملت کو بھی، کانگریس کے پراپیگنڈے کا جلدی شکار ہو سکتا ہے۔ شاہین بچے کو صحبت زاغ کے اثر بد سے بچانا ضروری تھا، اس لیے کہ نوجوانوں میں کانگریس کا مؤقف اثر کرنے لگ گیا تھا۔ مگر ان کی حیرت کی حد نہ رہی جب اچانک انہوں نے مولانا حسین احمد مدنی کا یہ بیان سنا کہ "قومیں وطن سے بنتی ہیں"۔ اسی لیے تو گھبرا کر اور پریشان ہو کر یہ شعر کہے تھے۔

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ
ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است!

سرود برسرِ منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر ز مقامِ محمدِ ؐ عربی است

بہ مصطفٰیؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بو لہبی است![1]

پہلا شعر حضرت حافظ کے شعرِ ذیل کی تحریف ہے۔

حسنؓ ز بصرہ، بلالؓ از حبش، صہیبؓ از روم
ز خاک مکہ ابوجہل، ایں چہ بوالعجبیست

۱- ارمغانِ حجاز (اردو)، ص ۳۹/۶۹۱ -

پہلے مصرعے کی جگہ اپنا مصرعہ لگایا اور دوسرے مصرعے کو بدل کر مکہ کی جگہ دیوبند اور ابوجہل کی جگہ مولانا کو رکھ دیا ۔ علامہ کی تلخیٔ احساس اسی سے ظاہر ہے — ظاہر ہے کہ حضرت علامہ کی سمجھ ہی میں نہ آسکتا تھا کہ برصغیر کا اتنا بڑا دینی ادارہ اور وہاں سے یہ آواز آئے ؟

''اقبال کے حضور'' سید نذیر نیازی صاحب کی مرتب کردہ وہ ڈائری ہے جس میں حضرت علامہ کی وفات سے دو تین ماہ قبل کے مکالمات و حالات درج ہیں ۔ ظاہر ہے کہ ان دنوں حضرت علامہ کی صحت بڑی خراب تھی ، کئی امراض بیک وقت حملہ آور تھے ، بے چینی تھی اور کرب ، مگر اس کتاب کا مطالعہ کرنے سے احساس ہوتا ہے کہ مولانا حسین احمد مدنی کے اس مؤقف کے باعث جو اذیت پہنچی وہ جسمانی بیماریوں کی پیدا کردہ اذیت سے بہت زیادہ تھی ۔ فلسطین میں یہودیوں کے آباد کیے جانے اور وہاں یہودی وطن کی تشکیل کا مسئلہ بھی خون پی رہا تھا ، پنجاب میں یونیسٹوں کی کارروائیاں بھی تکلیف دہ تھیں ، یونینسٹوں کے معاون ''مخلص منافق'' بھی پریشانی کا باعث تھے ، یورپ کی مادہ پرستانہ اور استعماری ہوس اور وحشی تصورِ قومیت کا قدرتی تقاضا بن کر ایک بہت بڑی خونریز اور خونخوار جنگ کی پرچھائیاں اُفق پر نظر آرہی تھیں مگر ان ساری آفتوں میں سب سے قریبی آفت جس نے علامہ کی رگِ جاں کو زخمی کردیا تھا وہ مولانا محمد حسین کا یہ مؤقف تھا جس نے ''بنائے ملت'' ہی کو ضرب لگا دی تھی ۔ گزشتہ صفحات میں ''ملت'' کے تصور سے علامہ کی وابستگی کی جو تفسیر درج کی گئی ہے اور قومیت کے جدید تصور سے علامہ کی شدید نفرت کا جو ذکر رقم کیا گیا ہے اس کی روشنی میں بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ایک بہت بڑے عالمِ دین اور سیاسی قائد کے اس نئے مؤقف نے ان کے دل پر کتنا گہرا زخم لگایا ہوگا ۔ چنانچہ صفحوں کے صفحے اس دردناک صورتِ حال پر کی جانے والی گفتگو سے پر نظر آتے ہیں ۔ مثلاً ١٩ فروری (وفات سے دو ماہ

قبل) کی ڈائری میں مسطور ہے کہ حضرت علامہ نے فرمایا ''یہ جو ارشادِ ربانی ہے ، کنتم خیر امة اخرجت للناس[1] (تم بہترین امت ہو جسے پوری نوع انسان کے لیے پیدا کیا گیا ہے) تو ثابت ہوا کہ اُمت کی بنا وطن کی بجائے عقیدے پر ہے اور عقیدے کا تقاضا تھا کہ حضور رسالت مآب ؐ مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ ہجرت فرمائیں ۔ آیت بالا سے ظاہر ہے کہ ''الناس'' کا لفظ آیا ہے یعنی ساری اولاد آدم، آلِ ابراہیم نہیں ، قریش نہیں ۔ اسی طرح ۲۰ فروری کی ڈائریَ کے یہ الفاظ ملاحظہ کیجیے ، نیازی صاحب لکھتے ہیں ''ادھر حضرت علامہ کے اضطراب اور امت کے لیے دلسوزی کی یہ کیفیت کہ سوتے جاگتے بس یہی ایک خیال کہ اس مرحلے پر جب مسلمانوں کی موت و حیات کا سوال درپیش ہے ، جب مسلمان غیر منظم اور غیر متحد ہیں ، جب کفر و الحاد کا سیلاب تیزی سے بڑھ رہا ہے ، مخالف قوتیں ان کے خلاف صف آرا ہیں اور وہ خود دین سے بے بہرہ ، اگر کہیں علماء نے بھی سیاست کی وہ تعبیر قبول کر لی جس کی بنا مادیت پر ہے اور جس سے انجام کار (مسلمانوں کے) جداگانہ قومی وجود کی نفی ہو جائے گی تو کیا ہوگا اور پھر جداگانہ قومیت کے حق کی بنا پر حضرت علامہ نے برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کی جس علیحدہ ریاست کا مطالبہ کر رکھا تھا اس کا کیا بنے گا ۔''

گویا تا دمِ آخر جو غم لاحق تھا اور جو خدشہ درپیش تھا وہ یہ تھا کہ ''ملت'' کا کیا بنے گا ۔ خدا نخواستہ کہیں ملت اقوام میں تحلیل تو نہ ہو جائے گی ۔

ہنوز ایں چرخ نیلی کج خرام است
ہنوز ایں کارواں دور از مقام است

۱- قرآن کریم - سورة ۳ ، آیت ۱۱۰ -

زکارِ بے نظامِ او چہ گویم
تو می دانی کہ ملت بے امام است[1]

حق تو یہ ہے کہ علامہ کی زندگی کا بہت سا حصہ اسی اضطراب میں بسر ہو گیا کہ ملت کو کس طرح متحد کیا جائے، ملت کو کس طرح غلامی سے نجات دلائی جائے، ملت کس طرح اپنے پاؤں پر دوبارہ کھڑی ہو، کس طرح اپنا مقام پہچانے اور دنیا میں خدا کے آخری آئین کو نافذ کر کے نوعِ انسانی کے لیے دنیا کو جنت عدن کا صحیح بدل بنا دے تا کہ آدم کا احساس غربت ختم ہو۔ اسی بیتابی اور اسی کش مکش میں جان جاں آفریں کو سونپ دی۔ قطعۂ ذیل میں یہ ساری کیفیت بطورِ اختصار اور بطریقِ احسن بیان ہو گئی ہے۔

حضورِ ملت بیضا تپیدم
نوائے دلگدازے آفریدم
ادب گوید سخن را مختصر گوے
تپیدم، آفریدم، آرمیدم![2]

لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا حضرت علامہ کا تصور ملت کبھی آگے چل کر سیاسی اتحاد کی صورت بھی اختیار کر سکتا ہے یا سمتھ صاحب کے بقول چونکہ ''یہ اتحاد محض جذبے ہی کا اتحاد ہے''، لہٰذا جذبے ہی کا اتحاد رہے گا۔ بات، یہ ہے کہ سمتھ صاحب کا مفہوم خواہ کچھ ہی ہو اتحاد تو درحقیقت جذبے ہی کے اتحاد کا نام ہے، جذبہ موجود ہے تو خوب ہے۔ ویسے ہم دیکھ رہے ہیں کہ مسلم اقوام عملاً بھی ''ملت'' بننے کی کوشش کر رہی ہیں۔ اگر یہ نہیں تو اسلامی ملکوں کے وزرائے خارجہ کے اجتماعات کا کیا مفہوم؟ اسلامی مملکتوں کے سربراہوں کی رباط میں یکجائی، اسی طرح موتمر عالمِ اسلام کے موقع پر لاہور میں اکٹھ، صلاح، مشورہ کیا معنی

۱- ارمغانِ حجاز، ص ۳۲/۹۱۴۔
۲- ایضاً ، ص ۵۵/۹۳۷۔

رکھتا ہے ؟ پھر جدہ میں اسلامی سیکریٹریٹ کا کیا مطلب ہے ؟ اب تو کسر بس اتنی سی باقی ہے (جیسا کہ عدی امین صدر یوگنڈا نے کہا ہے) کہ اسلامی ممالک کے سربراہ ایک معین مدت کے لیے آپس میں کسی کو سربراہ تسلیم کر لیا کریں۔ سربراہ باری باری چنا جاتا رہے۔ شاہ فیصل شہید بھی اسی راہ پر گامزن تھے۔ یہ آزاد اور دلخواہ اتحاد کوئی دور کی منزل نہیں۔ اور پھر یہ اسلامی کنفیڈریسی جو جغرافیائی ، نسلی ، لسانی اور لونی امتیازات اور تفرقات سے بالا اور مبرا ہوگی ، وحدتِ آدم کی طرف بہت بڑا قدم ثابت ہوگی — یہ عالی شان آفاق نظریہ دینِ اسلام ہی پیش کر سکتا ہے — باقی سارے ازم مشق خاک بازی ہیں اور آدم کی حیوان سازی ، پھر کوئی وجہ نہیں کہ باطل نظریات ایک روز جھڑ نہ جائیں اور حق غالب نہ آئے اور اسلام کی ہمہ جہتی ، مساوات اور عدالت کا دور دورہ نہ ہو —وہ مساوات و عدالت جو قرآن و سنت کی روشنی میں خلافت راشدہ نے قائم کرنے کی بھرپور اور کامیاب کوشش کی تھی — انشاء اللہ یہ ہو کر رہے گا ، اور اس لیے ہو کر رہے گا کہ بقول علامہ

جہانگیری بخاکِ ما سرشتند
امامت در جبینِ ما نوشتند

درون خویش بنگر آں جہاں را
کہ تخمش در دلِ فاروق رض کشتند[1]

۱- ارمغانِ حجاز ، ۹۶۲/۸۰ -

تنِ بے روح سے بیزار ہے حق
خدائے زندہ، زندوں کا خدا ہے

علّامہ اقبال اور مرگِ مجازی

مصر کے مشہور شاعر احمد شوقی نے کہا تھا :

الناس صنفان موتی فی حیاتهم
و 'اخرون ببطن الارض احیاء

''لوگ دو قسم کے ہیں ، ایک قسم اُن کی جو جیتے جی مرے پڑے ہیں اور دوسرے وہ جو قبر میں بھی زندہ ہیں''۔ مرگِ مجازی سے اپنی مراد پہلی موت ہے اور مجازی آنجہانی یہی لوگ ہیں جو سانس تو لے رہے ہیں لیکن ان کا شمار زندوں میں نہیں — چلتی پھرتی لاشیں — وہ نامسعود وجود جن کو قبروں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا ہو اور جستجوئے قبور میں ادھر سے آدھر اور آدھر سے ادھر مارے مارے پھرتے ہوں ، ایسے لوگوں کی حیات کو حیات کون کہے گا ، ان کی حیات ایک مرگِ مسلسل ہے ، اس اعتبار سے ان کی حیات کو اگر کوئی حیات کہنے پر مصر ہو تو وہ حیاتِ مجازی ہی کہلائے گی ، حیات جسے حقیقت سے کوئی واسطہ نہ ہو ، ایسی بے معنی زندگی کے مالک وہ افراد ہیں جن کی روحیں منجمد اور قلب افسردہ ہیں ، مقصد ناپید ہے اور عزم نابود ، نیکی اور بدی کے شعور سے محروم بلکہ آدمیت کے احساس ہی سے عاری ۔

ایسے افراد جس معاشرے میں جتنے زیادہ ہوں گے وہ معاشرہ اتنا ہی مردہ اور بے ذوق ہوگا ۔ ظاہر ہے کہ معاشرہ افراد کی زندگی سے زندہ اور افراد کی مرگ سے مردہ کہلاتا ہے ، زندگی ذمہ داری

کا نام ہے اور ذمہ داری کا احساس خود آگاہی کے بغیر ممکن نہیں۔ جب کوئی فرد یہی نہ جانتا ہو کہ وہ کیا ہے اور کائنات میں اس کا مقام کیا ہے تو اسے یہ کیونکر پتہ چلے کہ اس کے فرائض کیا ہیں اور پھر جب تک یہ راز نہ کھلے کہ فرائض کیا ہیں تو یہ کیونکر واضح ہو کہ حقوق کس حقیقت کا نام ہے۔

لیکن خود آگاہی مقامِ آدمیت سے آگاہی کا دوسرا نام ہے، اور یہ بڑا کٹھن مرحلہ ہے۔ آدمی خاک سے نمودار ہوا اور سینکڑوں گونا گوں عناصر نے اس کے جسدِ عنصری کی پرورش اور تکوین میں حصہ لیا۔ وہ ایک جاندار قطرۂ آب سے شروع ہوا اور پلا بڑھا۔ اگر اس کی تربیت نہ ہو تو وہ تمام عمر ایک چلتا پھرتا ملبہ بنا رہتا ہے، اس کی روح بیدار نہیں ہوتی۔ اگر اس کی تربیت ہو تو جب بھی جسم کا ملبہ اسے چین نہیں لینے دیتا۔ مادی دنیا سے برآمد ہونے والا اور مادی عناصر سے خوراک حاصل کرنے والا وجود اپنے مادی مصدر کی جانب کھنچتا رہتا ہے۔ اگر وہ عزم و ارادہ سے کام لے کر روح بیدار نہ رکھے تو اس کے وجود کا ملبہ مادی ملبے کی طرف واپس چلا جاتا ہے۔ گویا وہ بحیثیت انسان رحلت کر جاتا ہے اور ایک دوپایہ باقی رہ جاتا ہے۔ علامہ اقبال کہتے ہیں۔

دلے چُوں صحبتِ گل می پذیرد
ہماندم لذتِ خوابش بگیرد

شود بیدار چوں 'من' آفریند
چو 'من' محکومِ تن گردد بمیرد[1]

مطلب یہ ہے کہ دل جب مٹی کا مصاحب بنتا ہے تو اسی دم اسے لذتِ خواب آن لیتی ہے، جب وہ اپنے اندر "میں" (خودی)

۱- ارمغانِ حجاز، ص ۱۲۲/۱۰۰۴ -

پیدا کر لیتا ہے تو جاگ پڑتا ہے ۔ مگر پھر جب اس ''میں'' پر تن مسلط ہو جائے تو وہ وفات پا جاتا ہے ۔ یہ وفات مجازی وفات ہے ، وہ بظاہر زندہ ہی ہوتا ہے ۔ قرآن کریم کے بارے میں خداوند تعالیٰ کا ارشاد ہے ۔ ان ھو الا ذکر و قرآن مبین لینذر من کان حیا و یحق القول علی الکافرین[1] ۔ ''قرآن تو پڑھی جانے والی واضح کتاب ہے تا کہ وہ اس کو ڈرائے جو زندہ ہے اور ان کے حق میں اتمام حجت کر دے جو منکر ہیں''۔ یعنی قرآن تنبیہہ تو کرتا ہے مگر انہیں جو زندہ ہیں ، مردوں سے تو خطاب نہیں کیا جاتا ۔ اس طرح اگر ایک گروہ مردوں کا ٹھہرا ، دوسرا گروہ ان کا جو منکر ہیں ، وہ جو ہوش و حواس تو رکھتے ہیں ، جانتے بھی ہیں کہ قرآن کا ارشاد کیا ہے مگر اپنی ہوس ، تمکنت اور حیوانیت کو ترک کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے ۔ ان کے حق میں قرآن اتمام حجت کر دیتا ہے ۔ پھر جب وہ لوگ پکڑے جائیں تو یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہمیں قبل از وقت متنبہ نہیں کیا گیا ۔ قرآن کریم نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کر کے کہا ''و ما انت بمسمع من فی القبور ان انت الا نذیر''[2] یعنی آپ ان کو تو کچھ نہ سنا سکیں گے جو قبروں میں ہیں ۔ آپ کا کام تو ڈرانا ہے اور بس ۔ واضح ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کام تنبیہہ کرنا ہے ، خطرے سے آگاہ فرمانا ہے ، پاداش عمل سے ڈرانا اور گمراہی اور انکار خدا کے عواقب ذہن نشین کرنا ہے ، اس سے زیادہ ان کی ذمہ داری نہیں ۔ کوئی مانے یا نہ مانے ۔ ہاں مگر یہ تو ظاہر ہے کہ جو زندہ ہوں گے وہ سن لیں گے ، جن کے دل بیدار اور روحیں ہوش میں ہوں گی وہ حقیقت کو پا لیں گے ، جن کے دلوں پر پردہ پڑا ہوگا ان کی مثال اہل قبور کی سی ہے ۔ ایک عرب شاعر

۱- قرآن کریم - سورہ ۳۶ ، آیت ۷۰،۶۹ -
۲- قرآن کریم - سورۃ ۳۵ ، آیت ۲۲ -

کہتا ہے -

لقد اسمعت لو ناديت حياً
ولكن لا حياة لمن تنادی !

قرآنی مفہوم کے مطابق ''ان کی آنکھیں تو ہیں مگر وہ دیکھتے نہیں ، ان کے کان تو ہیں مگر وہ سنتے نہیں ، ان کے دل تو ہیں مگر وہ بات کو سمجھتے نہیں ، وہ حیوان بن کر رہ گئے ہیں بلکہ وہ تو حیوانوں سے بھی گئے گزرے ہیں''- یہاں بھی وہ مفہوم کہ بحیثیت انسان ان کی رحلت ہو چکی ، ایسے افراد اور ایسے معاشروں کو خدا اپنی رحمت کے سائے سے محروم کر دیتا ہے اور انہیں پیدائش عمل کی گھڑی کے نازل ہونے تک ان کے حال پر چھوڑ دیا جاتا ہے - خدائے زندہ کا مردوں سے کیا کام -

ترا تن روح سے نا آشنا ہے عجب کیا آہ تیری نارسا ہے
تن بے روح سے بیزار ہے حق خدائے زندہ زندوں کا خدا ہے[1]

اسی مضمون کو انہوں نے شعر ذیل میں دہرایا ہے -

نگاہ عشق دل زندہ کی تلاش میں ہے !
شکار مردہ سزاوار شاہباز نہیں[2]

بہر طور یہ امر بالکل عیاں ہے کہ قوم یا معاشرہ کوئی ایسی شے نہیں جو ہوا میں معلق ہو ، وہ زندہ و بیدار افراد کا ٹھوس مجموعہ ہے اور ان کی بدنی اور روحانی ، مادی اور فکری ، ذہنی اور عقلی کاوشوں کے توافق کا نام ہے - لہٰذا فرد کا قومی مصالح کے لیے بیدار ، باشعور اور باحوصلہ ہونا لازم ہے - بڑے افراد پیدا ہی بڑے نہ ہوئے تھے ، ان کے کاموں نے اور ان کی محنت نے انہیں بتدریج بڑا

۱- بال جبریل ، ص ۹۰/۳۸۲ -
۲- ایضاً ، ص ۳۸/۳۳۰ -

بنایا ، جوں جوں افراد سے بڑے کام عمل میں آئیں اُن کے کرنے والے بھی بڑے ہوتے چلے جاتے ہیں اور جس قوم میں کارہائے نمایاں سرانجام دینے والے افراد موجود ہوں وہ قوم دوسری اقوام کے مقابل سربلند ہو جاتی ہے اور اس کا احترام زندہ قوموں کی بزم میں ایک اہم قوم کی حیثیت سے ہونے لگتا ہے ۔ علامہ اقبال نے بجا فرمایا تھا :

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا[۱]

جس طرح افراد کو غفلت یا مرگِ مجازی سے پالا پڑتا ہے ، اسی طرح اقوام بھی متاثر ہوتی ہیں ۔ مسلم معاشرے نے بھی ایسے انقلابات بارہا دیکھے ہیں ۔ سوچنے والے اذہان اور دردمند دل کے مالک افراد اپنی اپنی جگہ کام کرتے رہے ۔ مسلمان مایوس نہیں ہوتا تاہم اگر وہ مرحلہ خدا نخواستہ آ جائے جب افراد معاشرہ یہ سوچنے لگیں کہ ہم کیا کر سکتے ہیں اور پھر خود ہی جواب بھی دے دیں کہ ہم تو کچھ بھی نہیں کر سکتے ، تو جان لیجیے کہ برے دن آن لگے اور اب قوم کا اللہ ہی حافظ ہے ۔ ''ہم تو کچھ بھی نہیں کر سکتے'' کا مرحلہ اس وقت آتا ہے جب بے نظمی اور بے عنوانی عام ہو جائے ، اوپر سے لے کر نیچے تک افرادِ معاشرہ کی اکثریت محض اپنی ذاتی غرض و ہوس اور فقط اپنی تن پروری کی خاطر کارفرما ہو ۔ سیاست ، تجارت ، ملازمت ، زراعت ، غرض جملہ شعبے آپا دھاپی کے صیدِ زبوں بن کر رہ جائیں ۔ پھر دیکھا دیکھی بدی کے میدان میں مسابقت آن پڑے ۔ کون زیادہ اہل ہے کا اصول پیشِ نظر نہیں رہتا ، اس کے برعکس فخر اس پر ہونے لگتا ہے کہ نا اہل تر کون ہے ، کون دوسروں سے زیادہ بدکار

۱- ارمغانِ حجاز ، ص ۱۵/۶۵۷ -

ہے ، کون دوسروں سے زیادہ دنیوی ٹھاٹھ باٹھ قائم رکھ سکتا ہے ، کون زیادہ ظالم پرور ہے اور رہزن دوست ، کون زیادہ رند ہے اور خدائی خوار ۔ غرض اقدار معکوس ہو کر رہ جاتی ہیں اور مثبت اقدار کے مالک افراد بے آسرا دکھائی دینے لگتے ہیں ، اور ان کے حقوق غصب ہونے لگتے ہیں ۔ بے آسرا کی کوئی فریاد نہیں سنتا ۔ حضرت عبدالقادر بیدل نے کیا خوب کہا ہے

جائے کہ زہ کنند کمانہائے امتیاز
منظورِ این و آں نہ شدن ہم نشانۂ ایست

ظاہر ہے کہ جب افراد کے اپنے مزاج میں ضبط باقی نہ رہے تو پھر ضابطے کہاں کے ؟ ایسے معاشرے کے افراد کو مجموعی اعتبار سے آدمیوں کا معاشرہ نہیں کہا جا سکتا ، وہ سوسائٹی محض وحوشستان ہوتی ہے اور اس سوسائٹی سے تعلق رکھنے والے افراد کو آدمی کے بجائے محض Biological Organism کہنا صحیح قرار پاتا ہے ۔ ہوس کی زندگی اور تن کی پوجا کا اور نتیجہ ہو بھی کیا سکتا ہے ؟

دل کی آزادی شہنشاہی ، شکم سامانِ موت
فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم ؟[1]

آپا دھاپی کی اس فضا میں حق بات کسی کی سمجھ میں آتی ہی نہیں ۔ ایسی حالت خواہ کسی بھی قوم میں رونما ہو ، پریشان کن ہوتی ہے اور سوچنے والے افراد احساسِ اذیت کے جہنم میں جلنے لگتے ہیں ۔ اس لیے وہ لوگ ایسے معاشرے میں بیگانے اور پردیسی ہو کر رہ جاتے ہیں ۔ ایسی آپا دھاپی کی زندگی کو علامہ اقبال نے کھلے بندوں موت قرار دیا ہے ۔

۱- بالِ جبریل ، ص ۳۲۵/۳۳ ۔

تن بخویش اندر کشیدن مردن است
از جہاں در خود رمیدن مردن است!

برتر از فکرِ تو آمد ایں سخن
زانکہ جانِ تست محکومِ بدن!۲

کیفیت یہ ہو تو علم اور علمی اسناد بھی مدد نہیں کرتیں، اس لیے کہ بے نظم اور منتشر شخصیت کا علم سے کچھ نہیں سنورتا۔ یہ کہنا غلط ہے کوئی اونچی علمی ڈگری کا مالک دوسروں کے حقوق غصب نہیں کر سکتا یا معاملات میں بد دیانت نہیں ہو سکتا یا یہ کہ عیاشی اور اوباشی کے کوچوں کی سیر نہیں کر سکتا یا یہ کہ وہ بڑی کرسی یا وسیع شان و شوکت کی خاطر قومی مفاد کو دغا نہیں دے سکتا۔ سقراط نے کہا تھا کہ لوگ شر سے آگاہ نہیں، اگر وہ جانتے شر کیا ہے تو اس کا ارتکاب نہ کرتے، یہ محض مفروضہ ہے، کتنے افراد ہیں جو آگاہ ہیں کہ شر کیا ہے اور خیر کیا ہے مگر ان کی ایسی تربیت نہیں ہو پائی جو انہیں حیوانی عواطف اور وحشی جذبات کو لگام دینے کی اہلیت و ہمت عطا کرتی۔ لہٰذا ان کی دانش، ان کی بے لگام خواہش کے آگے بے بس ہو کر رہ جاتی ہے۔

البتہ عام حیوانوں کے مقابل اہل علم کی حیوانیت اور بے راہ روی کا ایک خاصا یہ ہے کہ وہ دوسروں کو گمراہ کرنے کے معاملے میں زیادہ تر موثر اور نتیجہ خیز ثابت ہو سکتی ہے۔ سوسائٹی میں علم و تجربہ کو بہرحال ایک اعتبار حاصل ہوتا ہے لہٰذا اہلِ علم و تجربہ کی غلط روی سوسائٹی کے عام افراد کو لاشعوری طور پر بدی سے قریب لے آتی ہے۔ ان اہل وقار کے رویے کے بدولت اور مثال کے باعث ان کا بدی سے بدکنا ختم ہو جاتا ہے۔ اور پھر گویا بدی یا شر فیشن کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اور بقول مولانا حالی

۲۔ جاوید نامہ، ص ۱۰۲/۶۹۰۔

"سانچے میں ڈھل جاتی ہے" اور اس طرح قوم یا معاشرے کے شجرِ حیات کی جڑوں کو دیمک لگ جاتی ہے۔

چنانچہ سوسائٹی میں جو آدمی جتنے بھی اونچے مقامِ اعتبار پر فائز ہو اسے اتنا ہی زیادہ ذمہ دار ہونا چاہیے، اور اسے اتنا ہی بہتر مثال پیش کرنی چاہیے۔ اس لیے کہ اولادِ آدم کی بھاری اکثریت محض نقال ہوتی ہے اور علم و فکر کی سطح پر بھی یہ فطرتِ نقالی ان کی جان نہیں چھوڑتی۔ اور وہ سوچے سمجھے بغیر اور تجزیہ و تنقید کے جوہر سے کام لیے بغیر دوسروں کے نقشِ قدم پر چلتے رہتے ہیں، گویا ان کی اپنی بصیرت مر چکی۔ علامہ اقبال اس کیفیت کے خلاف احتجاج کرتے ہیں اور کہتے ہیں۔

اگر تقلید بودے شیوۂ خوب   پیمبرؐ ہم رہِ اجداد رفتے[1]

اگر بے سوچے سمجھے دوسروں کی نقالی کوئی اچھا اسلوب ہوتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی وہی کرتے رہتے جو آن کے آبا کرتے رہے تھے مگر آپؐ نے غلط روایات و عقائد کے خلاف بغاوت کا آوازہ بلند کر دیا۔

ذرا غور کریں تو یہ نقالی درحقیقت ذہنی غلامی ہے اور یہ سیاسی غلامی سے بد تر ہے۔ سیاسی غلامی ذہن اور بدن دونوں کو مقید رکھتی ہے اور اس طرح غلام قوم کے افراد بالعموم احساسِ کمتری میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ وہ حاکم اور غالب گروہ کے اطوار اختیار کرنے لگتے ہیں اور چشمِ امتیاز وا نہیں کر پاتے۔ آن سے بہ لطائف الیحل بھی اور جبراً بھی تقلید کرائی جاتی ہے اور تقلید کرنے والوں کی حوصلہ افزائی عمل میں آتی ہے۔ زاغوں کو "آنریری عندلیب" بنا دیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسوں کی دانش قابلِ اعتماد نہیں ہوتی۔

۱- پیامِ مشرق، ص ۲۲۲/۳۹۲ -

بقول حضرت علامہ

بھروسا کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر
کہ دنیا میں فقط مردانِ حُر کی آنکھ ہے بینا ![1]

یہ غلامانہ زاویۂ نظر وہ بد بلا ہے کہ ظاہری زنجیرِ غلامی ٹوٹ جانے پر بھی افیون کی طرح رگ و ریشہ کو نکما اور کاہل بنائے رکھتی ہے۔ یہ غلام سوچنے کی ذمہ داری حاکموں پر ڈال دیتے ہیں اور اس طرح سہولت میں رہتے ہیں، پھر جو فیصلہ اوپر والوں کا وہی فیصلہ ان کا۔ حکم بجا لانا اور پیٹ بھرنا، گویا زندگی اس سے آگے کچھ نہیں۔

از غلامی مردِ حق زنار بند   از غلامی گوہرش نا ارجمند

کور ذوق و نیش را دانستہ نوش
مردۂ بے مرگ و نعشِ خود بدوش
آبروے زندگی در باختہ
چوں خران با کاہ و جو در ساختہ[2]

پیٹ بھرنا اور حیوانی سطح پر غیر ذمہ دارانہ زندگی بسر کرنے کا خواہاں رہنا مردہ ذہانتوں کا شیوہ ہے۔ چنانچہ علمی و فکری سطح پر چند مقولوں اور اصولوں کا فیشن بن جانا بڑا ہی زہرناک امر ثابت ہوتا ہے۔ علامہ اقبال اس کھوکھلی مگر بظاہر بڑی خوبصورت اقتباس پسندی اور حوالہ پرستی کے ماہرین کی کورانہ تقلید سے بڑی توبیخ کے ساتھ منع کرتے ہیں۔

کر بلبل و طاؤس کی تقلید سے توبہ
بلبل فقط آواز ہے، طاؤس فقط رنگ ![3]

۱۔ بالِ جبریل، ص ۳۱۶/۲۴۔
۲۔ زبورِ عجم، ص ۵۷۲/۱۸۰۔
۳۔ بالِ جبریل، ۳۶۸/۷۶۔

نام نہاد ''روشن خیال'' لوگ یا ''نک چڑھے'' دانشور کچھ غلط اقدار کو اور مہمل افکار کو اپنے پر فریب الفاظ میں لپیٹ کر اور وسعت مطالعہ کی دھونس کے ساتھ سوسائٹی میں چلا دیتے ہیں ، ان کے پاس مُثبت محض خواب ہے اور منفی ٹھوس حقیقت ۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فیشن کے ساتھ وابستہ ہونے کی خاطر دانشور کہلانے کے شوق میں نمائشی افراد اپنی دانش سے رخصت اور تعطیل طلب کر لیتے ہیں ۔ یہ انسان کی فطرت ہے ۔ اگر وہ تربیت سے محروم رہے تو انکسار کا جوہر نشو و نما نہیں پا سکتا ہے ۔ انکسار کے بغیر روح مردہ رہتی ہے اور روح جتنی مردہ ہو جسم اتنا ہی تنتا ہے ، چنانچہ نمائش اور ریا اور ڈینگ مردہ روحوں کا شیوہ ہے ۔ یہ کوئی تازہ انکشاف نہیں ، یہ قدیم حقیقت ہے اور ہر حقیقت قدیم ہے ۔ کسی نے خوب کہا ہے

All truth is old only error ir original.

چنانچہ یہ فیشن گزیدگی اور ''روشن خیالوں'' کی اندھی تقلید بھی کوئی تازہ بدبختی نہیں ، یہ بھی ہمیشہ انسان کے ساتھ رہی ہے اور اسے اس کی اصل زندگی اور اصل حیثیت سے محروم کر کے مصنوعی زندگی اور مصنوعی حیثیت عطا کرتی رہی ہے ۔ مثلاً عہدِ بنی عباس کے ایک شاعر نے اپنے ایک دوست کو مخاطب کیا ۔

یا بن سعید یا ابا جعفر
اظہرت دیناً غیر ما تخفی !

لست بزندیق و لکنما !
احببت ان تعرف بالظرف

معنی ہے اے ابو جعفر بن سعید تم جس دین کا اظہار کر رہے ہو

وہ اس سے مختلف ہے جس کو تم چھپا رہے ہو - میں جانتا ہوں کہ تم دہریے نہیں ہو مگر تم چاہتے ہو کہ اپنے آپ کو دہریہ ظاہر کر کے لبرل (Liberal) اور روشن خیال کہلوا سکو - واضح ہوا کہ یہ علم خودی کو بیدار کرنے کے بجائے خودی کے قتل کا ارتکاب کرتا ہے - یہ علم ''اپنی نظر سے دیکھنا'' نہیں سکھاتا -

دیکھے تو زمانے کو اگر اپنی نظر سے
افلاک منور ہوں ترے نورِ سحر سے ![1]

ایسی دانش ، نمائشی اور فرمائشی دانش اور کھوکھلی بہیمی شخصیتوں کے کھوکھلے جملوں اور ''حوالوں'' کی کورانہ تقلید افراد ہی کو نہیں پوری کی پوری اقوام کو موت سے ہمکنار کر دیتی ہے - چنانچہ علامہ اقبال فریاد کرتے ہیں کہ جب تم بے تربیت علم کی زہرناکی کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو تو پھر مجھ سے کیا پوچھتے ہو ؟

چو سی بینی کہ راہزن کارواں کشت
چہ پرسی کاروانے را چساں کشت

مباش ایمن ازاں علمے کہ خوانی
کہ از وے رُوحِ قومے میتواں کشت[2]

جس طرح جسم کو بعض غذائیں موافق آتی ہیں ، بعض غذائیں موافق نہیں آتیں ، بعض تو جسم کی موت کا سبب بن جاتی ہیں ، اسی طرح بعض خوراکیں قلب کو موافق نہیں آتیں اور ان میں بعض ایسی بھی ہوتی ہیں جو آخرکار اس کی موت کا سبب بن جاتی ہیں - قلب کے لیے اچھی غذا وہ باتیں ہیں جو روشنی ، ولولہ ، اُمید ،

۱- ضربِ کلیم ، ص ۱۲۲/۵۸۴ -
۲- ارمغانِ حجاز ، ص ۱۰۱/۹۸۳ -

مقاومت ، استقلال ، صبر ، صداقت ، استغنا وغیرہ کے اوصاف پیدا کریں اور ہمہ نوعی بلندیوں کی راہ دکھائیں - غلط دواؤں کی طرح غلط افکار بھی قتل کر ڈالتے ہیں - چنانچہ نظریات اور آرا کا انتخاب کرتے وقت بھی ہوشیار رہنا چاہیے - کون سی آرا قومی زندگی کے عمومی مزاج کے لیے مفید ہیں اور کون سی مُضر - ایک بزرگ دوست کے بقول ذہن کی کھڑکیاں کھلی رہنی چاہئیں مگر جب دھواں ، غبار اور بدبو قسم کی کوئی شے تشریف لانے لگے تو انہیں بھی بند کر دینا چاہیے - اسی طرح افکار کے دھوئیں ، غبار اور بدبوئیں بھی ذہن کی کھڑکیوں کی راہ سے حجلۂ دل میں داخل ہوتی ہیں - لہٰذا ذہن کی کھڑکیوں کے بارے میں بھی احتیاط لازم ہے - پھر جس طرح انفرادی زندگی میں اس امر کا خیال ضروری ہے ، اسی طرح اجتماعی زندگی میں بھی ضروری ہے - قوم کا بھی ایک ظاہری وجود ہوتا ہے اور ایک باطنی ، اس کا اجتماعی رویہ اور مزاج بتاتا ہے کہ اس کا اجتماعی بطون اور ضمیر کس حال میں ہے - اگر کسی قوم کا کوئی متعین مثبت مزاج نہیں تو جان لینا چاہیے کہ اس قوم کا جسد دل سے خالی ہے ، مطلب ہے کہ اس قوم کی کوئی مشترکہ پسند و ناپسند نہیں ، متحدہ مقاصد نہیں ، جہد للبقا کے لیے متفقہ لائحہ عمل نہیں - غرض وہ قوم جس کی کوئی شناخت ہی نہ ہو وہ دل سے خالی قوم ہے ، جس طرح دل سے خالی جسم مردہ ، اسی طرح دل سے خالی قوم مردہ -

زندگانی سوختن با ساختن　　در گلے تخمِ دلے انداختن !![1]

جب اس طرح نقالی ایک عام روش بن جائے تو پھر اس کا مقابلہ بڑے دل گردے کا کام ہے - اس لیے کہ روشِ عام کے خلاف چلنے والے شخص کو دیوانہ سمجھا جانے لگتا ہے - فارسی زبان کا مقولہ ہے کہ ہنرور در بے ہنراں خر - اسی طرح ایک صاحبِ نظر

۱- جاوید نامہ ، ص ۶۵۳/۶۵ -

بہت سے کوتاہ بینوں میں پھنس کر مبتلائے عذاب ہو جاتا ہے اور بقول کسے ''روح را صحبت نا جنس عذابیست الیم''۔ بہرحال سوسائٹی کے بگاڑ کا احساس کر لینے والا وہ شخص جو اصلاح کا ارادہ بھی رکھتا ہو، بے پناہ صعوبتوں سے دوچار ہوتا ہے۔ اس لیے ایسے شخص کی کوئی زبان ہی نہیں سمجھتا جیسا کہ شیخ علی حزیں نے کہا تھا:

کس زبانِ مرا نمی فہمد　　بہ عزیزاں چہ التماس کنم

چنانچہ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ بظاہر بڑے عالی ہمت لوگ مقابلے کی تاب نہ لا کر گردن ڈال دیتے ہیں۔ ایسے عالم میں علم، شعور، دانش اور ذہانت کے ساتھ ساتھ جرأتِ مجنونانہ کی شدید ضرورت ہوتی ہے ورنہ بگڑی ہوئی سوسائٹی کا دباؤ وہی کچھ کرنے پر مجبور کر دیتا ہے جو کچھ دوسرے کر رہے ہوں، اس لیے کہ وہ سوچتا ہے کہ میں اکیلا کیا کر لوں گا، اپنے نظریات سے اتنی محبت کہ دیوانگی خطاب پائے، دل کی زندگی کی علامت ہے اور اسی کے باعث ایک ٹھوس شخصیت وجود میں آتی ہے۔ سوسائٹی کا شکنجہ بڑا سخت ہوتا ہے مگر اس کے بغیر عزم و ایمان کی آزمائش کیونکر ہو؟ علامہ اقبال فرماتے ہیں۔

عقل دادی، ہم جنونے دہ مرا
رہ بجذبِ اندرونے دہ مرا
علم در اندیشہ می گیرد مقام
عشق را کاشانہ قلبِ لا ینام
علم تا از عشق برخوردار نیست
جز تماشا خانۂ افکار نیست[۱]

۱- جاوید نامہ، ص ۵۹۸،۵۹۷/۱۰،۹ -

جیسا کہ ابھی بیان ہوا ایسی سوسائٹی میں جس کو انسانی معاشرے کے بجائے ''وحوشستان'' کہنا زیادہ صحیح ہو درس انسانیت دینا ، تلقینِ انصاف کرنا ، اور تبلیغِ ایمان و امانت کی خاطر سرگرمِ عمل رہنا بڑی ہی اوگھٹ گھاٹی ہے اور محض ایک شخص کی کاوش و ہمت سے اصلاحِ احوال کی صورت عموماً متصور نہیں ہوتی - لیکن اہلِ یقین افراد اپنے معاشرے کے تنِ مُردہ میں از سر نو جان پھونکنے کی خاطر نتائج سے بے پروا جُت جاتے ہیں - ان افراد کو مسؤلیت کا احساس ایک مستی سی اور نشہ سا عطا کر دیتا ہے - حیوانی سطح پر رہنے والے اور انسانیت کی رُو سے مردہ افراد آن پر ہنستے ہیں ، انہیں دیوانہ کہتے ہیں - یہ الگ بات ہے کہ دو پایوں کا کسی کے بارے میں فتوائے دیوانگی ہی اس کے آدمی ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے - اصول و ایمان سے مضبوط وابستگی رکھنے والے لوگ ہی صحیح معنوں میں جانتے ہیں کہ کون سی موت زندگی ہے اور کون سی زندگی موت -

کھول کے کیا بیان کروں سرِّ مقامِ مرگ و عشق
عشق ہے مرگِ باشرف ، مرگ ، حیات بے شرف ![1]

دیوانے جب راہِ خدمت پر گامزن ہوتے ہیں تو اللہ سے پیشگی ضمانتِ کامیابی نہیں چاہتے ، وہ تو ایک بات جانتے ہیں ''السعی منی والاتمام من اللہ'' (کوشش میری طرف سے ، تکمیل خدا کی طرف سے) ، ایسے دیوانے یہ بھی خوب جانتے ہیں کہ سوسائٹی کے غلط رحجانات کو بارہا خدا کے پیغمبر[ؑ] بھی نہ روک سکے ، حضرت نوح[ؑ] نے نو سو سال وعظ و نصیحت اور تلقین و تبلیغ کے باوصف کامیابی حاصل نہ کی اور آخر بگڑی ہوئی سوسائٹی جو دل اور روح کے اعتبار سے مردہ ہوچکی تھی ، عذابِ الٰہی کے طوفان کی نذر ہو گئی - بنی اسرائیل

۱- بالِ جبریل ، ص ۳۳۱/۳۹ -

کے ضمن میں خدائے تعالٰی نے ایک سے زیادہ بار قرآن میں یاد دلایا ہے کہ انہوں نے انبیاء[ؑ] کے قتل تک کا بھی ارتکاب کیا ۔ اس لیے معاشرے کی عروقِ مردہ میں نئی جان دوڑانے کے خواہش مندوں کو اس بات سے بے نیاز اور بے خوف ہو کر میدانِ عمل میں کودنا چاہیے کہ وہ کامیاب ہوتے ہیں یا ناکام ۔ ہو سکتا ہے کہ اللہ کے نزدیک خلوص والے شخص کی ظاہری ناکامی کی قیمت زیادہ ہو اور ایک عام دنیا دار کی "فتوحات" کی کوئی اہمیت نہ ہو ۔ جن لوگوں کا ایمان یہ ہو کہ انہیں اس زندگی کے بعد ایک اور زندگی ملے گی اور وہ زندگی اِس موجودہ فانی اور عارضی زندگی کے مقابل دائمی اور باقی رہنے والی زندگی ہوگی ، وہ اس دنیا کی ظاہری کامیابی اور ناکامی کو کوئی اہمیت نہیں دیتے ۔ ان کے لیے زندگی کا تقاضا مسلسل جد و جہد ہے اور مسلسل جد و جہد کی راہ میں وفات پا جانا عین سرشاری ہے ۔ ایسی موت ہی تو مرد کی شان کے شایاں ہے ۔

نہ پنداری کہ مردِ امتحاں مرد
نمیرد گرچہ زیرِ آسماں مُرد
ترا شایاں چنیں مرگ است ورنہ
زہر مرگے کہ خواہی می تواں مرد ![1]

مومن کامیاب ہوں تو کہتے ہیں الحمد للہ ، ناکام رہیں تو کہتے ہیں الحمد للہ ، اس لیے کہ اللہ تو دلوں میں پوشیدہ ارادوں اور نیتوں کو دیکھتا اور اس کے مطابق نوازتا ہے ۔ حیات بعد الموت کا تصور مُردہ سوسائٹی کے دلوں میں ایمان کی طرح راسخ کر دیا جائے تو جواب دہی کا احساس اور محنت کے اجر کا یقین انہیں یاس کی سطح سے بلند کر سکتا ہے اور امید و آرزو کے درجۂ بلند پر پہنچا سکتا ہے، اول شرط یہ ہے کہ ایمان کا ولولہ اور خلوصِ خاطر موجود ہو ۔

۱- ارمغانِ حجاز ، ص ۹۹۶/۱۱۴ -

علامہ کہتے ہیں -

محبت کا جنوں باقی نہیں ہے
مسلمانوں میں خوں باقی نہیں ہے

صفیں کج ، دل پریشاں ، سجدہ بے ذوق
کہ جذبِ اندروں باقی نہیں ہے[1]

اسی مضمون کو زیادہ کرب کے ساتھ فارسی میں دہرایا گیا ہے -

پیشِ ما یک عالمِ فرسودۂ ایست
ملت اندر خاکِ او آسودہ ایست

رفت سوزِ سینۂ تا تار و کُرد
یا مسلماں مُرد یا قرآں بمرد ![2]

یعنی از کار رفتہ دنیا ہمارے سامنے ہے، اور اس دنیا میں ملت اسلامیہ بھی چین سے سانس لے رہی ہے ، حالانکہ مسلمان کا مزاج تو ہر لحظہ نیا انقلاب چاہتا ہے ، اس کی ترقی تو کہیں رکتی ہی نہیں ، اس لیے کہ اس کے پاس قرآن ہے جو ہر لحظہ ایک نیا جہاں تخلیق کرتا ہے -

بندۂ مومن ز آیاتِ خدا است
ہر جہاں اندر برِ او چُوں قباست !

چوں کہن گردد جہانے در برش
می دہد قرآں جہانے دیگرش[3]

اگر صورت یہ ہے تو پھر مسلمان جہانِ مردہ میں کس طرح زندہ رہ

۱- بالِ جبریل ، ص ۷۷/۸۵ -
۲- جاوید نامہ ، ص ۶۶۳/۷۵ -
۳- ایضاً ، ص ۶۵۴/۶۶ -

سکتا ہے ، اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان جہاں کہیں بھی ہے مردہ ہے — خواہ وہ ترک ہے ، خواہ کُرد ، خواہ کوئی اور — علامہ اقبال تو کہتے ہیں کہ قرآن جزو جاں بنے تو جان میں انقلاب آ جاتا ہے اور جب جان میں انقلاب آ جائے تو دنیا ہی بدل جاتی ہے -

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود[1]

میر تقی میر نے کہا تھا -

یہ توہم کا کارخانہ ہے
یاں وہی ہے جو اعتبار کیا !

یعنی خارجی دنیا ہمارے اندرونی احساس کا پرتو ہے ، اگر اندروں میں عزمِ تسخیر ہے تو کائنات کی ہر شے فتح مندی کے راستے کی علامت ہے ، اگر اندروں میں ہزیمت بسی ہے تو ذرہ ذرہ حملہ آور ہونے کو تیار - دل میں مسرت ہو تو پھول کا کھلنا خندۂ گل اور دل میں دکھ بس رہا ہو تو پھول کا جگر چاک - ایک نظر خوش ہے کہ اللہ نے کانٹوں کو بھی پھول عطا کر رکھے ہیں اور ایک نظر رو رہی ہے کہ اللہ نے پھولوں کو بھی کانٹے دے رکھے ہیں - اس اعتبار سے خدائے زندہ کی بھیجی ہوئی کتابِ زندہ جس قوم کے پاس ہو وہ مردہ دل اور مردہ ضمیر کیونکر ہو سکتی ہے ، اسے تو ساری کائنات مسخر اور مفتوح نظر آتی ہے -

اے چو شبنم بر زمیں افتندۂ در بغل داری کتابِ زندۂ[2]

۱- جاوید نامہ ، ص ۸۱/۶۶۹ -
۲- اسرار و رموز ، ص ۱۶۵/۱۶۵ -

لیکن قرآن کا محض پڑھ لینا اور معاملہ ہے اور قرآن کا دل میں اترنا اور مسئلہ ہے - خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم پر بھی جب قرآن اُتارا گیا تھا تو آپؐ کے قلب پر آتارا گیا تھا جیسا کہ آیاتِ ذیل سے عیاں ہے -

و انہ لتنزیل رب العلمین ط نزل بہ الروح الامین ، علٰی قلبک لتکون من المنذرین بلسان عربی مبین[1] (بیشک یہ رب العالمین کی اتاری ہوئی کتاب ہے - اس کو روح الامین نے آپؐ کے قلب میں آتارا ہے تا کہ آپ بھی ڈرانے والوں میں شامل ہو جائیں - یہ کتاب بڑی واضح عربی زبان میں آتاری گئی) گویا وحی کا مقام و مسکن قلب ہے ، ذہن یا حافظہ نہیں - قرآن کا دل میں آترنا دل کی بادشاہی ہے - ایسے عالم میں کوئی مردِ مومن کائنات کی کسی قوت سے وقتی طور پر بھی مرعوب نہیں ہو سکتا ، احساسِ کمتری میں مبتلا ہونا تو دور کی بات ہے -

مقامِ شوق بے صدق و یقیں نیست
یقیں بے صحبتِ روح الامینؑ نیست

گر از صدق و یقیں داری نصیبے
قدم بے باک نہ ، کس در کمیں نیست ![2]

کسی پوشیدہ دشمن کا خوف تو رہا ایک طرف ، مومن کا دل زندہ تو راہِ خدا میں خطرات کے بڑھنے سے اور بھی زیادہ سرشار ہوتا ہے ، اس لیے کہ ایسی صورتِ حال اس کے دل کو اور بھی زیادہ مومن بنا دیتی ہے - خدا پر بھروسا اور بھی پختہ اور مستحکم ہو جاتا ہے

۱- قرآن کریم - سورہ ۲۶ ، آیت ۱۹۱ــــ۱۹۵ -
۲- ارمغان حجاز ، ص ۱۰۲۵/۱۴۳ -

جیسا کہ غزوۂ احزاب کے زمانے میں ہوا - پس منظر یہ ہے کہ ابو سفیان نے مکہ میں قریش اور ان کے حلیفوں کو خوب تیار کیا تاکہ مدینہ منورہ پر یورش کر کے مسلمانوں کی جمعیت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پریشان اور قوت کو ملیا میٹ کر کے رکھ دیا جائے - نیز یہ کہ ابو سفیان نے اپنی دھاک بٹھانے کی خاطر کچھ آدمی بھی مدینہ شریف بھیج دیے جو قریش اور ان کے حلیفوں کی قوت اور تیاری کا ذکر بڑے مرعوب کن انداز میں کرتے تھے اور مسلمانوں کو ڈراتے تھے کہ تمہارے دشمنوں نے یہ یہ کچھ سامان جنگ اکٹھا کر رکھا ہے ، تم ان کا مقابلہ نہ کرسکو گے ، ان سے ڈرو — اطاعت کرو ، ہتھیار پھینک دو ورنہ مارے جاؤ گے - یہ لوگ گویا مدینہ طیبہ میں ابو سفیان کی ''لابی'' بنا رہے تھے جو مسلمانوں کی معنویت (Morale) کو برباد کرنے کے لیے عمل پیرا رہے مگر مسلمانوں پر اس کا الٹا اثر ہوتا تھا - ان کا خدا پر ایمان اور بھی بڑھ جاتا تھا اس لیے کہ یہ صورت حال انہیں خدا کی پناہ لینے پر اور بھی زیادہ مجبور کرتی تھی - ابوسفیان نے سمجھا تھا کہ مسلمان گھبرا کر خدا سے بدگمان ہو جائیں گے - اسے احساس نہ تھا کہ مسلمان گھبرائیں تو خدا کی طرف بھاگتے ہیں ''الذین قال لھم الناس ان الناس قد جمعوالکم فاخشوھم فزادھم ایماناً وقالوا حسبنا اللہ و نعم الوکیل''[۱] — وہ لوگ بھی تو ہیں کہ جن کو لوگوں نے کہا کہ لوگ (تم سے لڑنے کے لیے) بہت کچھ اکٹھا کر لائے ہیں ، لہٰذا ان سے ڈرو - تو اس بات نے ان کا ایمان اور بھی بڑھا دیا ، اور وہ کہہ اٹھے کہ ہمیں خدا کافی ہے اور وہ سب سے بہتر معتمد ہے -

مگر اس کے برعکس کچھ وہ لوگ ہیں جن کا ایمان بے جان

۱- قرآن کریم - سورہ ۳ ، آیت ۱۷۳ -

ہوتا ہے اور وہ خدا پرست کی حیثیت سے کسی شمار و قطار میں نہیں آتے۔ ایسے لوگوں کے بارے میں قرآن کریم کا ارشاد ہے "ومن الناس من یعبد اللہ علٰی حرف فان اصابہ خیر ن اطمئن بہ و ان اصابہ فتنۃ ن انقلب علٰی وجہہ خسر الدنیا والاٰخرۃ ، ذالک ھوالخسران المبین"[١] (لوگوں میں وہ بھی تو ہے جو اللہ کی بندگی کرتا ہے مگر عین کنارے پر ، اگر اسے بھلائی میسر رہے تو اللہ کے باب میں مطمئن رہتا ہے اور اگر آزمائش و امتحان کی صورت سے واسطہ پڑ جائے تو پیٹھ دکھا دیتا ہے ، اس نے دنیا بھی کھوئی اور آخرت بھی۔ یہ وہ خسارہ ہے جو بڑا واضح ہے۔) ایسے بے یقین افراد کو ازروئے ایمان وجود زندہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اور حضرت علامہ کو دکھ اسی بات کا ہے کہ انہیں اپنے دور حیات میں وہ مسلمان نہ ملے جو موت کو زندگی جانیں اور جن سے موت خائف رہے۔ انہوں نے وہ مسلمان دیکھے جو دم مرگ تک موت سے لرزتے رہیں ، لیکن وہ نہ دیکھے جن سے موت لرزہ براندام ہو۔

مسلمانے کہ مرگ ازوے بلرزد　　جہاں گردیدم و آو را ندیدم ![٢]

یہ سانس لینے والی نعشیں وہ لوگ ہیں جن کے دل مر چکے، امید نے ساتھ چھوڑ دیا ، یاس نے آن لیا اور یاس کے جلو میں طرح طرح کے واہمے اور وسوسے چلے آئے ، پھر وہ واہمے اور وسوسے اس انداز میں خاطر نشیں ہوئے کہ جو شخص ان واہموں اور وسوسوں کو غلط بتائے وہ پسند نہ آئے ، وہی پسند آئے جو اس باب میں ہم خیال اور ہم رائے ہو۔ مزاج کی ایک نہج بن جاتی ہے۔ چرسی چرسی ہی کی باتوں سے محظوظ ہوتا ہے ، شرابی شرابی ہی کے پاس جاتا ہے،

١- قرآن کریم - سورہ ٢٢ ، آیت ٣٣ -
٢- ارمغان حجاز ، ص ٩٢٢/٣٠ -

متقی کو متقی ہی کے پاس راحت ملتی ہے ، عاشق عاشقوں ہی کی مجلس میں موانست محسوس کرتا ہے ۔ یہ بالکل قدرتی بات ہے ، یہ مزاجی ہم جنسی بڑی زوردار باہمی کشش کا باعث ہوتی ہے ۔ چنانچہ سانس لینے والے مردے اپنے ہی جیسوں کے پاس جاتے ہیں ، اس کا علاج یہ ہے کہ ان لوگوں کی مصاحبت اختیار کی جائے جو اصحابِ ایمان ہیں ، جن کے اعمال مثبت ہیں ، اور وہ پختہ یقین کی دولت سے مالامال ہیں ۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ 'الفتح الرحانی' میں لکھتے ہیں :

انت میت القلب و صحبتک ایضاً لموتی القلوب علیک بالاحیاء والنجباء والبدلاء ، انت قبر تاتی قبراً مثلک ۔ میت تاتی میتاً مثلک ۔ انت زمن یقودک زمن مثلک ۔ اعمیٰ یقودک اعمیٰ مثلک ۔ اصحب المؤمنین الموقنین الصالحین و اصبر علیٰ کلامهم و اقبله واعمل به وقد افلحت ۔ ”تو مردہ دل ہے چنانچہ تیری صحبت بھی مردہ دلوں کے ساتھ ہے ۔ تجھے چاہیے کہ ان کا دامن گیر ہو جو زندہ ہیں ، جو نجیب اور جو نجیبوں کے خلف ہیں ۔ تُو تو قبر ہے اور اپنی ہی جیسی قبر کے پاس آتا ہے ۔ تُو تو مردہ ہے اور اپنے ہی جیسے مردے کے پاس آتا ہے ۔ تُو تو لاغر ہے اور تیری قیادت تیرے ہی جیسے لاغر ہاتھوں میں ہے ۔ تُو تو اندھا ہے اور تیری رہبری تیرے ہی جیسا اندھا کر رہا ہے ۔ اہلِ ایمان ، اہلِ ایقان اور صالحین کی مجلس اختیار کر ۔ ان کی بات حوصلے سے سُن ، اسے قبول کر اور اس کے مطابق عمل پیرا ہو ، پھر جان لے کہ تُو نے فلاح پائی “۔ حضرت علامہ فرماتے ہیں :

دلِ مردہ دل نہیں ہے ، اسے زندہ کر دوبارہ
کہ یہی ہے اُمتوں کے مرض کہن کا چارہ[1]

دل میں شبہات اور خوف زا توہمات کا ورود ایمان و محبت کی آگ کے بجھ جانے سے ہوتا ہے ۔ اس کی مثال یہ ہے کہ چولہا ٹھنڈا ہو جائے تو چیونٹیاں اور کیڑے مکوڑے وہاں سیر کرنے کے لیے تشریف لے آتے ہیں لیکن ذرا آگ جلائی جائے تو بھاگ اُٹھتے ہیں ۔ یہی حال دلِ مردہ کا ہے ۔ اس کا علاج محبت کی تپش اور ایمان کا سوز ہے اور بقول حضرت علامہ

وہی دیرینہ بیماری ! وہی نامحکمی دل کی !
علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی ![2]

اور یہی مضمون ساقی نامہ میں دہرایا گیا ہے ۔

شرابِ کہن پھر پلا ساقیا
وہی جام گردش میں لا ساقیا

مجھے عشق کے پر لگا کر اُڑا
مری خاک جگنو بنا کر اُڑا

ہری شاخِ ملت ترے نم سے ہے
نفس اس بدن میں ترے دم سے ہے

تڑپنے پھڑکنے کی توفیق دے !
دلِ مرتضٰی سوزِ صدیق دے

جگر سے وہی تیر پھر پار کر !
تمنا کو سینوں میں بیدار کر ![3]

۱- ضربِ کلیم ، ص ۹۸/۳۶ -
۲- بال جبریل ، ص ۳۰۳/۱۱ -
۳- ایضاً ، ص ۴۱۶/۱۲۴ -

ظاہر ہے کہ مے سے مراد ایمان کی وہ منزل ہے جسے عشق کہتے ہیں ۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے کہا تھا :

قدح سے دل ہے مراد اور مے سے عشق غرض
میں وہ نہیں کہ نہ سمجھوں زبانِ بادہ فروش

علامہ اقبال کے یہاں ساقی سے اکثر اوقات حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مراد ہوتی ہے اور ''دل مرتضیٰ سوز صدیق'' اور کس کی توجہ سے حاصل ہوگا ۔ وہ کیفیت تو عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک مرتبہ ہے ۔ ایک حدیث ہے ''لا ایمان لمن لا محبة لہ'' (جس کے دل میں محبت نہیں وہ ایمان سے محروم ہے ۔) اور محبت آپؐ ہی کی محبت ہے ۔ اسی محبت کی کمی ہمارے دلوں کی نامحکمی ہے اور اسی محبت کی سرشاری دل کی ہر بیماری کا مداوا ہے ۔ خوف ، خدشہ ، عناصر کی غلامی وغیرہ ہر بلا سے نجات اور ہر آزمائش میں فتح و نصرت اسی محبت کی بدولت حاصل ہوتی ہے ۔

شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب ! میرا سجود بھی حجاب !

تیری نگاہِ ناز سے دونوں مراد پا گئے
عقل ، غیاب و جستجو ! عشق ، حضور و اضطراب ![1]

اسی عالمِ سرشاری میں علامہ یہ بھی اعلان کرتے ہیں کہ

طبعِ مسلم از محبت قاہر است مسلم ار عاشق نباشد کافر است[2]

مسلمان مسلمان کی حیثیت سے زندہ ہے یا مردہ اس کی نشانی یہی ہے کہ وہ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں دنیا و مافیہا

۱- بالِ جبریل ، ص ۴۰۶،۴۰۵/۱۱۴،۱۱۳ ۔
۲- اسرار و رموز ، ص ۶۲/۶۲ ۔

سے منہہ موڑتا ہے یا نہیں - جسے محبت بلند نظری عطا نہیں کرتی وہ زمین کا ہو کر رہ جاتا ہے اور یہ مسلمان کا شیوہ نہیں - قرآن کا فیصلہ دو ٹوک ہے ، اس کی کوئی تاویل قابلِ قبول نہیں ہو سکے گی -

قل ان کان اباءکم و ابناءکم و اخوانکم و ازواجکم و عشیرتکم و اموال ن اقترفتموها و تجارة تخشون کسادها و مساکن ترضونها احب الیکم من الله و رسوله و جهاد فی سبیله فتربصوا حتی یاتی الله بامره ط و الله لایهدی القوم الفٰسقین -[۱] ''اے رسول ؑ! ان سے کہہ دیجیے کہ اگر تمہیں تمہارے والدین ، فرزند ، بھائی ، بیویاں ، اعزہ ، کمائی ہوئی دولت ، تجارت جس میں مندے کا خوف لاحق ہے اور رہائشی عمارات جن کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے ہو اللہ سے ، اللہ کے رسول سے اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے سے عزیز تر ہیں تو پھر چوکس رہیے تا آنکہ اللہ اپنا فیصلہ صادر کردے - اللہ نافرمان اور بدعنوان لوگوں کو سیدھی راہ نہیں دکھاتا -''

سیدھی سی بات ہے کہ اگر عشق ہے تو اس پر ہر شے نثار ، بت پر تو کسی شے کو ترجیح نہیں دی جا سکتی ہے - محبوب وہی ہے جسے ترجیح حاصل ہے - پھر اگر اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اللہ کی راہ میں ہر شے قربان کر دینے کا جذبہ موجود نہیں تو پتہ چل گیا کہ محبت دنیا سے ہے اور دنیا کی فنا پذیر حالتوں سے ہے - ماسوا اللہ وہ ہر شے ہے جو محبت کا مرکز بن جائے ، وہ گویا ایک جھوٹا خدا ہے ، پھر اور کافری کیا ہوتی ہے ----

---

۱- قرآن کریم ، سورہ ۹ ، آیت ۲۴ -

بقول حضرت علامہ

بتوں سے تجھ کو امیدیں ، خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے ![1]

ایک عرب شاعر کہتا ہے -

لو کان حبک صادقاً لا طعتہ،
ان المحب لمن یحب مطیع،

''یعنی اگر تیری محبت صادق ہوتی تو 'تو مرضی' محبوب کے حضور سرِ تسلیم خم کر دیتا - اس لیے کہ محب وہی ہوتا ہے جو محبوب کا اطاعت گزار ہو''۔۔ بقول علامہ

تابعِ حق دیدنش نادیدنش
خوردنش ، نوشیدنش ، خوابیدنش[2]

اگر یہ نہیں تو پھر دل حق پرست نہیں ، وہ بت پرست ہے - زبان جو جو دعوے کرتی ہے وہ خیالاتِ خام کی ترجمانی ہے - زبان کے کلمات کا دل سے کوئی تعلق نہیں - دنیا پرست کی نماز بھی شرک اور شرع کی دیگر پاسداریاں بھی شرک ، اس لیے کہ فیصلہ تو دل پر منحصر ہے اور دلوں کے بھید وہی جانتا ہے جو دلوں کا خالق ہے - خدا تو ہماری قربانیوں کے پیچھے جو خلوصِ نیت کارفرما ہوتا ہے اسے دیکھتا ہے ، یہاں تک کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ''رب تال للقران و القران یلعنہ، '' (کتنے ہیں قرآن کی تلاوت کرنے والے جن پر قرآن لعنت بھیج رہا ہوتا ہے -) ، اس لیے کہ قرآن کے مطالعہ میں تو محض زبان مصروف ہوتی ہے ، قرآن کے

۱- بال جبریل ، ص ۳۴۰/۴۸ -
۲- اسرار و رموز ، ۶۲/۶۲ -

احکام پر دل آمادہ نہیں ہوتا اور طبیعت کاربند نہیں ہوتی ۔ دل اور طبیعت کا رحجان بدستور خلافِ قرآن اعمال اور آمال کی طرف رہتا ہے ۔ دنیوی تمنائیں اور مادی ہوا و ہوس حسین بتوں کی طرح دل میں آباد رہتی ہیں جن پر ایمان کو قربان کر دیا جاتا ہے ۔ حضرت علامہ کے الفاظ میں یوں کہہ لیجیے ۔

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اولیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات !¹

جیسا کہ اوپر کہیں بیان ہوا ، آدمیوں کی اکثریت تجزیاتی دانش سے عاری ہوتی ہے اور اس کے لیے اصول و ضوابط کے ساتھ لگاؤ پیدا کرنا آسان نہیں ہوتا ، لہٰذا ان کے لیے آسان راہ نقالی ہے اور تقلید بچے — گھروں میں بڑوں کو دیکھتے ہیں ، اس لیے سوسائٹی میں جو جتنا بڑا ہو آسے اتنا ہی زیادہ محتاط رہنا چاہیے کیونکہ اس کے عمل سے اس کا حلقۂ اثر مثال اور نمونہ حاصل کرتا ہے ۔ چنانچہ جب وہ لوگ جو درجہ بدرجہ دوسروں کے لیے نمونہ بن سکتے ہیں یا جن سے سوسائٹی کے افراد کو زیادہ سے زیادہ واسطہ رہتا ہے اچھے اعمال سے قطع تعلق کر لیں اور غلط راہوں پر چل دیں تو پوری قوم بے راہ رو ہو جاتی ہے ۔ اس لیے کہ روشن اور مثبت معیار پیشِ نظر نہیں رہتے ، اصول رحلت کر جاتے ہیں اور دل مر جاتے ہیں ، لوگ زندہ لاشوں کے سوا کچھ نہیں رہ جاتے ۔ ہر سوسائٹی میں درجہ بدرجہ ارباب حکم و انتظام کا کردار بڑا کام کرتا ہے ۔ اسی طرح اہلِ علم کا طبقہ جسے موجودہ دور میں Intelligentsia کہا جاتا ہے ، جو سوسائٹی کی ان پڑھ اکثریت کے لیے طرزِ عمل اور سلوک کا معیار قائم کرتے ہیں اور کچھ وہ جو یوں تو دنیا کی ہر سوسائٹی میں موجود رہے ہیں مگر مسلم ملت میں انہیں اہم مقام

۱- بالِ جبریل ، ص ۴۰۴/۱۱۲ -

حاصل رہا ہے ، میرا مطلب ہے صوفیہ اور دراویش ، جو مسلمانوں کی روحانی تربیت کو اپنا فریضہ جانتے تھے اور دنیا سے بے نیاز ہو کر درسِ اخلاق و انسانیت دیتے تھے ۔ ایسے لوگ اب بھی ہیں مگر کم ہیں ، اور جو ہیں ان میں خالص سونا اور بھی نایاب ، بہرحال مسلم معاشرے کی انہوں نے بے حساب خدمت کی ، اگر اُمت کو بادشاہوں اور دوسرے حاکموں کی غلط مثال پریشان کرتی تھی تو یہ لوگ اپنی پاکیزہ سیرت اور مستغنی روش اور ہمدردی و دلجوئی کی مثال سے حوصلہ بندھاتے تھے ۔ ایسے لوگ اُمت کو ہر دور اور ہر مقام پر میسر رہے جن کی بدولت امت کا اخلاقی ڈھانچہ ایک ہزار سال سے زائد عرصے تک مربوط رہا ۔ لیکن اگر خدا نخواستہ حکام ، اہلِ علم اور اہلِ فقر یعنی وہ سب اہم طبقے جن کو سوسائٹی کے وجود کے لیے ریڑھ کی ہڈی کا کام دینا ہے یکساں شکارِ خرابی ہوں تو پھر باقی کیا رہا اور پھر وہ سوسائٹی زندہ انسانوں کی سوسائٹی کیسے کہلائے ۔

حضرت ابوبکر وراق جو بڑے مشہور صوفی اور دیگر اکابر صوفیہ کی طرح بڑے جید عالم اور فاضل بزرگ تھے، کہتے ہیں کہ لوگ تین قسم کے ہیں ، ایک امراء (حکام) ، دوم علماء ، سوم فقراء ۔ جب امراء بگڑ جائیں تو رعیت کی معاش اور کمائی بگڑ جاتی ہے ، جب علماء بگڑ جائیں تو عبادات اور شریعت کے طریق بگڑ جاتے ہیں اور جب فقراء بگڑجائیں تو لوگوں کی عادات خراب ہوجاتی ہیں۔ امراء کا بگاڑ ظلم کے باعث صورت پذیر ہوتا ہے ، علماء کو طمع خراب اور فقرا کو ریا اور نمود و نمائش برباد کردیتی ہے — پھر اگر مسلمانوں کے کسی معاشرے میں حکام ، علماء اور فقراء تینوں طبقے بگڑ جائیں تو اس معاشرے میں زندگی کہاں باقی رہی ؟ قرآن اولادِ آدم کے لیے کامل منشورِ خلافت ہے اور ظاہر ہے کہ وہ کسی خاص قوم اور نسل اور وطن کے لیے نہیں ۔ اگر ایک جمعیت جو حاملِ قرآن ہونے

کی مدعی ہو قرآن کے حقوق ادا نہ کرے گی تو خداوند متعال کسی اور جمعیت کو یہ موقع عطا کر دیں گے کہ وہ خداوندی منشور کو نافذ کرے اور اس کی روشنی میں دنیائے آدم کی بہبود و ترقی کا اہتمام کرے - اس لیے کہ قرآن کریم کو باقی اور محفوظ رکھنے کی ذمہ داری خدا نے اپنے ذمے لے رکھی ہے - انا نحن نزلنا الذکر و انا لہ لحفظون -[۱] قرآن کی محافظت کا مطلب یہی نہیں کہ قرآن لوگوں کو زبانی حفظ ہو ، قرآن کی محافظت کا معنٰی ہے اس کے احکام و قضایا اور اوامر و نواہی کا نفاذ اور اس کے نفاذ کا تحفظ - جو قوم اس فرض کی ادائی سے کوتاہی کرے گی وہ قیامت کو سزا بھگتے گی ، قیامت کو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم بحضورِ خدا شکایت کریں گے ''و قال الرسول یا رب ان قومی اتخذوا ھذا القراٰن مھجوراً -[۲] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہیں گے ''اے میرے رب ! میری قوم نے قرآن سے منہہ موڑ لیا تھا -''

اور پھر واضح ہے کہ کتاب جو زندہ آئین ، زندہ دستور ، زندہ اخلاق اور زندہ انسانیت ہے مردوں کے پاس تو نہیں چھوڑی جا سکتی - چنانچہ مُردوں کو ہٹا دیا جائے گا یا یہ کہ ان سے قرآن لے لیا جائے گا اور انہیں دیا جائے گا جو مُردہ نہ ہوں اور اس کتاب زندہ سے زندگی اندوز رہیں - و ان تتولوا یستبدل قوماً غیرکم ثم لا یکونوا امثالکم -[۳]

اس مضمون کو حضرت علامہ نے بھی بڑی دردمندی کے ساتھ اشعارِ ذیل میں بیان کیا ہے جن کا مفہوم یہ ہے کہ ہماری قوم میں

۱- قرآن کریم ، سورہ ۱۵ ، آیت ۹ -
۲- " " ، سورہ ۲۵ ، آیت ۳۰ -
۳- " " ، سورہ ۴۷ ، آیت ۳۸ -

قرآن پڑھا تو جاتا ہے مگر قرآن کے ساتھ قلبی لگاؤ نہ پڑھنے والوں کو ہے نہ پڑھانے والوں کو۔ اگر یہ بات ہے تو جان لینا چاہیے کہ اللہ ہم جیسی ناکارہ قوم اور بے اثر قوم سے یہ نعمت لے لے گا۔ ایسی ہزاروں قومیں موجود ہیں جو قرآن کے مطابق عمل پیرا ہونے کا عہد کر لیں گی۔ ذکر حق اس یا اُس دور یا امت کے ساتھ وابستہ نہیں، نہ اس نہ اُس جگہ سے اس کا تعلق ہے۔ لہذا خدا قرآن کو ہم سے لے کر کسی بھی دوسری اہل قوم کو دے سکتا ہے۔ علامہ کہتے ہیں اس وقت مسلمان محض ظن و گمان اور تقلید کورانہ پر چل رہا ہے اور میں اس خیال سے لرز کر رہ جاتا ہوں کہ مبادا کسی روز اللہ مسلمان کو اپنے عشق کے سوز سے محروم کر دیں اور یہ عنایت کسی اور کے دل میں ودیعت ہو جائے۔ وہ دن بے پناہ محرومی کا دن ہوگا۔

محفلِ ما بے مے و بے ساقی است
سازِ قرآن را نوا ہا باقی است

زخمۂ ما بے اثر افتد اگر
آسمان دارد ہزاران زخمہ ور

ذکرِ حق از امتان آمد غنی
از زمان و از مکان آمد غنی!

ذکرِ حق از ذکرِ ہر ذاکر جداست
احتیاجِ روم و شام او را کجاست

حق اگر از پیشِ ما بردار دش
پیشِ قومے دیگرے بگزاردش

از مسلمان دیدہ ام تقلید و ظن
ہر زمان جانم بلرزد در بدن!

ترسم از روزے کہ محرومش کنند
آتشِ خود بر دلِ دیگر زنند!۱

خدا نہ کرے کہ ایسا ہو - خدا نہ کرے کہ قرآن ہم سے کہے ''اے اُمت مسلمہ کے مُردہ معاشرہ، میں اُن کے پاس چلا جو زندہ ہیں اور زندگی کے قدردان - اب تم میرے اہل نہیں رہے -''

۱- جاوید نامہ، ص ۶۷۰، ۶۶۹/ ۸۲، ۸۱ -

نہیں فقر و سلطنت میں کوئی امتیاز ایسا
وہ سپہ کی تیغ بازی یہ نگہ کی تیغ بازی

طور پر بے راہ رَو ہو جانے کا بڑا قریبی امکان ہے ۔ اس کی خود اعتمادی ہی کو دھکا نہیں لگتا بلکہ وہ اپنے اعتقاد کی پٹڑی سے بھی اُتر جاتا ہے ۔ میر تقی میر نے کہا تھا ۔

ترے فراق میں جیسے خیال مفلس کا
گئی ہے فکرِ پریشاں کہاں کہاں میری

تاہم اس امر کا خیال بھی نہایت ضروری ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک اور قول بھی منسوب ہے اور وَہ ہے ''الفقر فخری'' (فقر میرے لیے وجہ افتخار ہے) ایک بات تو عیاں ہے کہ آپ ایسے فقر کو اپنا افتخار قرار نہ دے سکتے تھے جس کے ڈانڈے کفر سے مل رہے ہوں ۔ چنانچہ اس فقر کا مفہوم یہ ہے کہ آپ نے تمول اور عیش و آسائش کی روش حیات کو پسند نہ فرمایا اور اس کے مقابل درویشانہ سادگی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا ۔ یہ آپؐ کا اپنا انتخاب تھا ۔ ظاہر ہے کہ آپؐ نے کبھی دولت جمع نہ کی ، جو کچھ گھر میں ہوا وہ ایثار کی نذر ہوا ۔ ایثار کا معنٰی ہے اپنی ضرورت پر دوسروں کی ضرورت کو ترجیح دینا ۔ ہمیں معلوم ہے کہ آپؐ کی حیات طیبہ کے آخری سالوں میں عرب کے بیشتر اقطاع اسلامی حکومت کا حصہ بن گئے تھے اور غنائم کے علاوہ زکٰوۃ و خراج کی صورت میں ہر طرح کے اموال آپؐ کے یہاں آ رہے تھے مگر آپؐ جب تک جملہ اموال کو تقسیم نہ فرما دیتے چین نہ لیتے تھے ۔ آپؐ کی صاحبزادی حضرت فاطمۃ الزہراؓ کے ہاتھوں میں چکی پیستے پیستے چھالے اور گٹے پڑتے رہے مگر آپؐ اپنی صاحبزادی کی درخواست کے باوصف ایک خادمہ کا بند و بست کر کے نہ دے سکے ۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ آپؐ کی بعثت کے اوائل میں قریش کے اکابر آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اور کہا تھا کہ آپؐ قریش کے بُتوں کے خلاف لب کشائی نہ کریں اور غلاموں کی حوصلہ افزائی نہ فرمائیں ۔ وہ اس کے عوض ہر وہ دولت

فقر ۔ کلامِ اقبال کی روشنی میں

لغوی معنوں میں فقر سے تنگدستی ، غریبی اور مفلسی مراد ہے ، لہٰذا فقیر وہ شخص ٹھہرا جو غریب ، تنگ دست اور مفلس ہو ۔ قرآن کریم میں کلمات فقر ، فقیر ، فقراء بارہا آئے ہیں ، مثال کے طور پر :

"الشیطٰن یعدکم الفقر و یامرکم بالفحشاء"[1] — شیطان تمہیں مفلسی سے ڈراتا ہے اور بڑی بدی (بُخل ، کنجوسی) کا حکم دیتا ہے ۔

"رب انی لما انزلت الی من خیر فقیر"[2] — اے میرے پروردگار تُو جو نعمت بھی مجھے دے دے میں اس کا محتاج ہوں ۔

"یا ایھا الناس انتم الفقرآء الی اللہ ، و اللہ ھو الغنی الحمید"[3] — اے لوگو تمہی اللہ کے محتاج ہو ، اللہ تو بے نیاز ہے اور جملہ خوبیوں کا مالک ہے ۔

اسی طرح بعض ایسے اقوال میں "فقر" وارد ہوا ہے جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب کیے جاتے ہیں ۔ مثال کے طور پر "کادالفقر ان یکون کفراً" (فقر کفر سے دور نہیں) اور یہ اس لیے کہ عالمِ تنگ دستی اور افلاس میں آدمی کے فکری اور عملی

۱- سورہ ۲ ، آیت ۲۶۸ ۔
۲- سورہ ۲۸ ، آیت ۲۴ ۔
۳- سورہ ۳۵ ، آیت ۱۵ ۔

مہیا کرنے کو تیار تھے جو آپؐ ان سے طلب فرماتے ، لیکن آپؐ نے جواب دیا ''خواہ آپ لوگ میرے ایک ہاتھ میں سورج رکھ دیں اور دوسرے میں چاند ، میں اپنے اس مشن کی تکمیل سے باز نہیں رہ سکتا جس کی تکمیل کی خاطر مجھے اللہ نے مبعوث کیا ہے۔'' اس طرح گویا فقر کی دو قسمیں ٹھہریں ، ایک وہ جو ناسماعد حالات کی عنایت سے آدمی پر بلا کی طرح مسلط ہو جائے اور دوسرا وہ جسے آدمی جملہ اسباب تمول مہیا ہونے کے باوصف خود اپنی خوشی اور رضا کے ساتھ انتخاب کر لے ۔ ظاہر ہے کہ جو فقر آدمی کا اپنا انتخاب ہے وہ روح کے لیے ، دل و دماغ کے لیے اضطراب یا عذاب نہیں ہو سکتا ، وہ تو اُلٹا ایک قسم کا شعورِ تسخیر عطا کر کے مسرت و فرحت سے لذت یاب کرتا ہے ۔ یہی باعث ہے کہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ ''غنیۃ الطالبین'' میں لکھتے ہیں ''فقیر کی شان کے شایاں یہ ہے کہ وہ اپنے فقر سے اتنی ہی محبت کرے جتنی کوئی دولت مند اپنی دولت سے کرتا ہے ۔ صاحبِ دولت کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس کی دولت میں کمی واقع نہ ہو ، اسی طرح فقیر کے لیے بھی ضروری ہے کہ اپنے فقر کو نقصان اور زوال سے محفوظ رکھے۔''[۱] گویا بزبانِ حضرتِ اقبال

فقر چیست اے بندگانِ آب و گل
یک نگاہ راہ بیں ، یک زندہ دل

فقر ذوق و شوق و تسلیم و رضا ست
ما امینیم ایں متاع مصطفےٰ ست[۲]

اس دوسرے یعنی اختیاری فقر نے ایک طرح سے اصطلاحی حیثیت اختیار کر لی ہے ، لہٰذا اپنے لغوی معنوں سے ہٹ گیا ہے ۔

۱۔ غنیۃ الطالبین (اردو ترجمہ) مدنی کتاب خانہ لاہور ، ص ۵۴۴ ۔

ایک اور قول رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب ہے ''لیس الغنٰی عن کثرۃ العرض و لکن الغنٰی غنی النفس'' (امیری مال و دولت کی کثرت کا نام نہیں ، امیری دل کی امیری ہے) اس امر پر حضرت علیؓ کا ارشاد ذیل مزید روشنی ڈالتا ہے ''ان اللہ تعالی فی خلقہ مثوبات فقر و عقوبات فقر فمن علامۃ الفقر اذا کان مثوبۃ ان یحسن خلقہ ۔ یطیع ربہ ولا یشکو حالہ و یشکر اللہ علٰی فقرہ ۔ و من علامۃ الفقر اذا کان عقوبۃ ان یسوء خلقہ و یعصی ربہ ۔ و یکثر الشکایۃ و یتسخط للقضاء''[۱] — خدا اپنی مخلوق کے لیے فقر کو انعام بھی بنا دیتا ہے اور سزا بھی ، اس کی انعامی صورت میں آدمی خوش خلق اور خدا ترس ہوتا ہے ، وہ اپنی حالت کی شکایت نہیں کرتا ۔ اس کے برعکس وہ خدا کا شکر گزار رہتا ہے جس نے اسے فقر سے نوازا ۔ مگر دوسری طرف اس کی سزائی صورت میں آدمی بد خلق ہو جاتا ہے ، خدا کی نافرمانی کرتا ہے ، اپنے احوال کی اکثر شکایت کرتا ہے اور قضا سے برہم رہتا ہے — چنانچہ وہ فقر جس سے ہم متعرض ہیں وہ علامہ اقبال کے کلام میں وارد ہونے والا اصطلاحی ، انتخابی ، اختیاری اور انعامی فقر ہے ، وہ فقر جو آدمی کے مزاج میں درویشی و بے نیازی کا جوہر ودیعت کر دے اور اسے دنیوی متاع کی حرص و ہوس کے بندھنوں سے آزاد کر کے اللہ کی شانِ بے نیازی سے نوازے ۔ یہ تو ظاہر ہے کہ ایک شخص جسے حالات نے کنگال کر دیا ہو وہ اس شخص سے قطعاً مختلف ہے جس نے خود اپنی مرضی سے تہی دستی قبول کی ہو ، باوصف اس کے کہ وہ صاحبِ دولت تھا یا اس کے پاس صاحبِ دولت بن جانے کے امکانات موجود تھے ۔ دولت کے ہوتے ہوئے یا حصولِ دولت کی

۱- عوارف المعارف ۔ ابو النجیب عبدالقاہر عبداللہ السہروردی ، بیروت ص ۱۶۱ ۔

موجودگی کے باوجود اس سے مجتنب رہنے والا ، درحقیقت فانی راحت و عیش کے ہوس ناک پھندے میں پھنسنے سے انکار کرتا ہے لیکن یہ عالمِ آزادی و بے نیازی آسانی کے ساتھ لائقِ حصول نہیں۔ یہ منزل فقط اہلِ عزم و ہمت ہی طے کر سکتے ہیں ، چنانچہ علامہ اقبال کہتے ہیں :

ہمت ہو اگر تو ڈھونڈ وہ فقر جس فقر کی اصل ہے حجازی
اس فقر سے آدمی میں پیدا اللہ کی شانِ بے نیازی !
یہ فقرِ غیور جس نے پایا بے تیغ و سناں ہے مرد غازی !
مومن کی اسی میں ہے امیری اللہ سے مانگ یہ فقیری[1]

ان اشعار کے مطالعے سے واضح ہو جاتا ہے کہ حضرتِ علامہ نے بھی اس کو لغوی معنوں میں نہیں بلکہ اصطلاحی معنوں میں استعمال کیا ہے ۔

فارسی میں فقر کا مترادف درویشی ہے اور فقیر کا درویش۔ حضرت داتا گنج بخش علی الہجویریؒ ''کشف المحجوب'' میں حضرت جنید بغدادیؒ کا ایک قول نقل کرتے ہیں : ''یا معشر الفقراء انکم تعرفون باللہ و تکرمون اللہ''۔ اور پھر اس کا ترجمہ فارسی میں اس طرح فرماتے ہیں (اور یہ خیال رہے کہ ''کشف المحجوب'' تصوف کے موضوع پر فارسی زبان میں لکھی جانے والی پہلی کتاب ہے) ''اے شما کہ درویشانند شما را بخداوند شناسند و از برائے خدا کرامت کنند ۔''[2]

لیکن ہمیں آگاہ رہنا چاہیے کہ علامہ اقبال کے نظریات کوئی یک بیک پختہ نہ ہوگئے تھے ۔ ان میں ایک نمایاں تدریج پائی جاتی

۱- ضربِ کلیم ، ص ۵۵۱، ۵۵۰/۸۹، ۸۸ -
۲- کشف المحجوب ، احمد ربانی ایڈیشن لاہور ، ص ۲۸ -

ہے - وہ کبھی ہندی متحدہ قومیت کے قائل تھے مگر بعد ازاں مسلم قومیت بلکہ ملت کے گیت گانے لگے ، یہی عالم نظریۂ عشق کا ہے - ان کے یہاں ابتدا میں عام مروج سہولت پسند عشق کے جلوے نظر آتے ہیں - چنانچہ انہوں نے حالی اور اکبر الہ آبادی کے ہوتے ہوئے داغ کو آستاد بنا لیا - عشق کا ایک مقدس بارگاہ بن جانا تو بہت بعد کی بات ہے ، اور وہ ، وہ مقام تھا جہاں انہوں نے پکارا - ع

عشق خدا کا رسول ، عشق خدا کا کلام !۱

اسی طرح اور کئی مسائل ہیں مثلاً خودی ، تقدیر وغیرہ - عرض کرنے کا مقصد یہ تھا کہ علامہ اقبال کے افکار انہیں بنے بنائے نہیں ملے ، اگر بنے بنائے ملتے تو آغاز کار ہی سے ہمیں معین اصطلاحات اور مقرر مفاہیم میسر آ جاتے ، مگر ایسا نہیں ہوا - ان کے افکار ایک قوی الاصل شجر کی طرح رفتہ رفتہ پروان چڑھے ، انہوں نے غور و فکر کے ساتھ زندگی بسر کی ، دن عالمِ اضطراب میں بسر کیے اور راتیں بے قراری میں گزاریں - فکری اضطراب اور قلبی بے قراری ، اس کیفیت کو وہ خود ، سوز و سازِ رومی اور پیچ و تابِ رازی قرار دیتے ہیں - یہی عالم فقر کا ہے ، چنانچہ شروع میں فقر بھی ان کے یہاں اپنے معمولی معنوں میں وارد ہوا ، اس ضمن میں واضح معنوی تبدیلی ہمیں ''بانگ درا'' کے تیسرے حصے کی ایک نظم میں شاید پہلی بار ملتی ہے - اس نظم کا عنوان ہے ''خطاب بہ جوانانِ اسلام''- اس نظم کا شعر ذیل تبدیلی کی نشان دہی کرتا ہے -

سہاں الفقر فخری کا رہا شانِ امارت میں !
''بآب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را''۲

بانگ درا کے بعد فقر اور اس کے مشتقات کا استعمال بڑھ جاتا ہے - ''ضربِ کلیم'' اور ''ارمغانِ حجاز'' میں جو آن کی زندگی کے آخری

۲- بالِ جبریل ، ص ۹۴/۳۸۶
۱- بانگِ درا ، ص ۱۸۰/۱۸۰ -

حصے کی تخلیق ہیں ، فقر کا اصطلاحی استعمال نسبتاً بہت زیادہ ہے اور عام صوفیہ و دراویش کی طرح وہ بھی اپنے آپ کو ''فقیر'' کہنے لگتے ہیں -

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید　　نسیمے از حجاز آید کہ ناید؟

سرآمد روزگارِ ایں فقیرے　　دگر دانائے راز آید کہ ناید؟[۱]

ہم نے دیکھا ہے کہ علامہ اقبال نے اصلی فقر کے حصول پر جسے وہ فقرِ حجازی قرار دیتے ہیں ، اکساتے وقت ایک شرط عائد کی ہے اور وہ ہے ''ہمت ہے اگر''۔ وہ جانتے ہیں کہ یہ مقصود سہل الحصول نہیں ، دل و دماغ کو اور ذہن و ضمیر کو بے لگام جبلتوں کے دباؤ سے آزاد رکھنا یا یہ کہ جبلتوں پر قادر ہوکر اپنی ذات پر حکمرانی کرنا ، پسند و ناپسند کو اپنی تربیت یافتہ مرضی کے تابع رکھنا بڑا ہی مشکل کام ہے اور فقط اہلِ عزم و ہمت ہی سے بن پڑتا ہے -

فقرِ قرآں احتسابِ ہست و بود
نے رباب و مستی و رقص و سرور

فقرِ مومن چیست؟ تسخیرِ جہات
بندہ از تاثیرِ اُو مولا صفات

فقرِ کافر خلوتِ دشت و در است
فقرِ مومن لرزۂ بحر و بر است![۲]

چنانچہ یہ امر واضح رہنا لازم ہے کہ فقر ترک دنیا یا رہبانیت کا نام نہیں - رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم تارک الدّنیا نہ تھے - آپ کچھ مدت غور و تامل کی خاطر خلوت نشیں ضرور رہے یا یوں کہیے کہ

۱- ارمغانِ حجاز ، ص ۱۲/۸۹۳ -

۲- پس چہ باید کرد ، ۲۲/۸۱۸ -

رہا کرتے تھے مگر وہ مطالعۂ ذات کا مرحلہ تھا۔ غور و تامل اور محض کنارہ کشی میں بڑا فرق ہے۔ علامہ اقبال کہتے ہیں :

در شبستانِ حرا خلوت گزید　　قوم و آئین و حکومت آفرید[1]

یہی عالم فقرائے اسلام کا ہے۔ ان کی خلوت گزینی بھی سوقت ہوتی تھی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ''تفقہ ثم اعتزل''[2] (خوب علم حاصل کر اور پھر خلوت میں چلا جا) وہ فقرائے اسلام جو حضرات الصوفیہ کہلائے اسی اصول پر کاربند تھے اور جب یہ حضرات تنہائی میں مطالعۂ ذات اور تزکیۂ نفس کا مرحلہ طے کر لیتے تھے تو مجسم ہدایت بن کر برآمد ہوتے تھے۔ حضرت غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا قول ہے ''حققوا الاسلام حتیٰ تصلوا الی الایمان ثم حققوا الایمان حتیٰ تصلوا الی الایقان ، فحینئذ ترون مالم تروہ من قبل الیقین ، یریکم الاشیاء کما ھی علیٰ صورتھا ، یصیر الخبر معاینۃ''[3]۔

''تم اسلام کو سچ سچ کا اسلام بناؤ تاکہ ایمان تک رسائی حاصل کر سکو ، پھر ایمان کو سچ سچ کا ایمان بناؤ تاکہ یقین تک رسائی حاصل کر سکو ، اس عالم میں تم وہ کچھ دیکھو گے جو کچھ یقین سے قبل نہ دیکھا تھا۔ یقین تمہیں صورت اشیا اس طرح دکھائے گا جس طرح کہ وہ اشیاء ہیں۔ یوں اطلاعی بات آنکھوں دیکھی بات بن جائے گی''۔

قرآن کریم میں آتا ہے ''عرب بادیہ نشین کہتے ہیں کہ ہم ایمان

۱- اسرار خودی ، ۱۹/۱۹ -
۲- الفتح الربانی و الفیض الرحمانی (القاہرہ ، مطبع المصطفیٰ البابی) ، ص ۱۰۸
۳- ایضاً ، ص ۱۵۸

لائے، اے رسولؐ ان سے کہہ دیجیے کہ تم ایمان نہیں لائے۔ البتہ تمہیں یہ کہنا چاہیے کہ تم نے اسلام قبول کیا ہے اس لیے کہ ایمان تو ابھی تمہارے میں داخل ہی نہیں ہوا۔"[1]

پھر عزلت و خلوت میں بھی فرق بیان کیا جاتا ہے۔ عزلت بھی ہے تو خلوت ہی مگر خلوت بسیط معنوں میں ہے، عزلت محدود معنوں میں ہے۔ خلوت غیروں سے ہے، عزلت اپنے نفس سے اور ہر اس چیز سے جو نفس کی جانب بلائے اور خدا سے غافل کر دے"[2]۔

کہنے کا مقصد یہ تھا کہ فقرائے اسلام نے جو اپنے اپنے دور کے چوٹی کے علماء اور فقہا میں سے تھے، خلوت و عزلت بھی اختیار کی تو تکمیلِ تعلیم کے لیے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع میں۔ وہ خلوت و عزلت کا مرحلہ طے کر کے آتے تو گویا کندن بن کر اور اپنے اسلام کو ایمان اور ایمان کو ایقان بنا کر لے آتے تھے تاکہ پورے یقین کے ساتھ اہلِ دنیا کو دین سکھا سکیں اور آداب و مقامِ انسانیت سے آگاہ کر سکیں۔

حضرت جنیدؒ نے احمد بن حواریؒ کے حوالے سے فرمایا (اور وہ احمد بن حواریؒ کا بڑا ہی احترام کرتے تھے) من عمل بلا اتباع رسول اللہ فعملہ باطل[3] "جس نے بے اتباع رسولؐ کوئی عمل کیا وہ عمل بے اساس ہے"۔ اسی طرح حضرت بایزید بسطامی کا قول ہے "لو نظر تم الیٰ رجل اعطی من الکرامات۔ حتیٰ

۱- قرآن کریم - سورہ ۴۹، آیت ۱۴ -

۲- عوارف المعارف، عبدالقاہر بن عبداللہ السہروردی، ص ۴۲۴ - ۴۲۵

۳- التعرف، القاہرہ، ص ۲۸ -

یر تقی فی الھواء فلا تغتروا بہ حتی تنظروا کیف تجدونہ عندالامر والنھی وحفظ الحدود لآداب الشریعۃ۔''[1]

''خواہ کوئی شخص صاحبِ کرامات ہی کیوں نہ نظر آئے یوں کہ بلندیوں میں پرواز کرنے پر قادر ہو، تم دھوکا مت کھانا۔ پہلے یہ دیکھو کہ اس کا عمل اوامر و نواہی کے ضمن میں کیا ہے، وہ حدود کا لحاظ کرتا ہے یا نہیں، شریعت کا احترام کرتا ہے یا نہیں۔''

اسلام کے جملہ مشاہیر فقراء بڑے وسیع علم و مطالعہ کے مالک رہے ہیں۔ حضرت داتا گنج بخشؒ ان کے بارے میں لکھتے ہیں: ''طریقۂ تصوف را اصلیت قوی و فرعی مثمر و جملہ مشائخ ایشاں از اہلِ علم بودہ اند و جملہ مریداں را بر آموختنِ علم باعث بودہ اند۔''[2] (طریقۂ تصوف کی جڑ مضبوط ہے اور شاخ پھل دار، اہل تصوف کے جملہ مشائخ اہلِ علم میں سے تھے اور وہ اپنے ارادت مندوں کے علم حاصل کرنے کا باعث تھے۔) یعنی وہ لوگ عالم تھے، اور اولاد آدم کے لیے اُستاد اور مرشد و مصلح کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس اعتبار سے وہ بڑے ہی مصروف لوگ تھے، وہ خانقاہوں میں بند رہبر نہ تھے، ان کی خانقاہیں مدرسے تھے، تربیت گاہیں تھیں۔ اسلام میں محض تارک الدنیا لوگ بھی گزرے ہوں گے مگر وہ لوگ واجب الاتباع نہ تھے اور نہ ہیں اور وہ مشاہیرِ شیوخ میں شاذ شاذ ہی گنے گئے۔ فقرائے اسلام حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشادِ معروف سے آگاہ تھے ''لا رھبانیۃ فی الاسلام''۔

حضرت مجدد الف ثانی نے شیخ عبدالہادی کے بارے میں سنا

۱۔ التعرف، القاہرہ، ص ۲۹ (حاشیہ)۔

۲۔ کشف المحجوب، احمد ربانی ایڈیشن، ص ۱۰۔

کہ خلوت گزیں ہونے کا ارادہ ہے تو انہیں ایک خط میں مخاطب کیا ”آپ نے گوشہ نشینی کی خواہش ظاہر کی تھی - بے شک گوشہ نشینی صدیقین کی آرزو ہے ، آپ کو مبارک ہو - آپ عزلت و گوشہ نشینی اختیار کریں لیکن مسلمانوں کے حقوق کی رعایت (نگہبانی) ہاتھ سے نہ جانے دیں -“[۱]

اس اعتبار سے دیکھیں تو فقراء اہلِ اسلام کی اجتماعی زندگی کے لیے ریڑھ کی ہڈی کا کام دیتے رہے - انہوں نے امت مسلمہ کے اعتقاد کو بحال رکھا اور اعتقاد پر اعتماد کو مستحکم رکھا - انہوں نے دین و شریعت کے بارے میں خلافِ دین و شریعت امور کی تائید کبھی نہ کی ، لٰہذا کجا اسلامی فقر اور کجا راہبی - حضرتِ علامہ کہتے ہیں :

کچھ اور چیز ہے شاید تری مسلمانی
تری نگاہ میں ہے ایک فقر و رہبانی

سکوں پرستیٔ راہب سے فقر ہے بیزار
فقیر کا ہے سفینہ ہمیشہ طوفانی

یہ فقر مردِ مسلماں نے کھو دیا جب سے
رہی نہ دولتِ سلمانیؓ و سلیمانیؑ![۲]

آخری سطر میں حضرت سلمانؓ فارسی اور حضرت سلیمانؑ کا ذکر ہے - حضرت سلمانؓ فارسی رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرب اصحاب میں سے تھے - ان کا شمار اصحابِ صفہ میں بھی ہوتا ہے - حضرت سلیمانؑ خدا کے پیغمبر تھے - حضرت سلمانؓ درویش تھے

۱- مکتوبات امام ربانی ، اردو ترجمہ دفتر اول ، نولکشور گیس پرنٹنگ پریس لاہور ، ص ۴۹۶ -

۲- ضربِ کلیم ، ۵۱۳،۵۱۲/۵۱،۵۰ -

اور حضرت سلیمانؑ بادشاہ تھے، آدمیوں پر ہی نہیں جنوں اور پریوں پر بھی فرمانروائی فرماتے تھے، دنیا کے وسیع خزانے ان کے قبضۂ تصرف میں تھے — لیکن علامہ اقبال نے دولت سلمانیؓ اور سلیمانیؑ کے زوال کو نتیجہ قرار دیا ہے زوال فقر کا - گویا فقر کی کسوٹی پر کسیں تو سلیمانی اور سلمانی میں کوئی تضاد نہیں کیونکہ بنیادی طور پر اہلِ فقر کے یہاں دل و نگاہ کی ہوس اور بھوک کا نام افلاس ہے - کسی بزرگ کا قول ہے ''مفلس آں نیست زاد ندارد ، مفلس آنست کہ مراد ندارد''۔ خواہ دولت کے انبار ہی میسر ہوں اور کچھ بھی متاع و مایہ دنیوی حاصل نہ ہو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ، بادشاہی دل کی بادشاہی ہے - حضرت علامہ کہتے ہیں :

آں مسلماناں کہ میری کردہ اند　　در شہنشاہی فقیری کردہ اند
در امارت فقر را افزودہ اند　　ہمچو سلماںؓ در مدائن بودہ اند
حکمرانے بود و سامانے نداشت　　دست او جز تیغ و قرآنے نداشت[۱]

اس سلمانیؓ و سلیمانیؑ رابطے اور رشتے کو حضرت داتا گنج بخشؒ نے کشف المحجوب میں واضح کیا ہے ، ممکن ہے حضرتِ علامہ نے ان دو اسماء کا تماثل کشف المحجوب ہی سے حاصل کیا ہو۔ داتا صاحب لکھتے ہیں ''ازانچہ ایوب را در شدت صبرش گفت 'نعم العبد' و سلیمانؑ را در استقامت ملکش گفت 'نعم العبد' چوں رضائے رحمٰن حاصل شد فقرِ سلمانؓ را چوں غناءِ سلیمانؑ گردانید۔''[۲]

''خدا نے حضرت ایوب کو ان کی انتہائی بے بسی کے عالم میں 'نعم العبد' قرار دیا اور حضرت سلیمانؑ کو ان کی انتہائی شوکت و اقتدار کے باوجود 'نعم العبد' کہا ، جب خدا کی رضائے کامل میسر ہو تو پھر حضرت سلمانؓ کی غربت اور

۱- پیامِ مشرق ، ص ۹۰/۲۰ -
۲- کشف المحجوب ، احمد ربانی ایڈیشن لاہور ، ص ۲۵ -

حضرت سلیمانؑ کی امیری میں کوئی فرق نہیں رہتا۔"

قرآن میں اہلِ ایمان کے واضح خصائل میں سے ایک خصلت یہ بیان کی گئی ہے "یؤثرون علیٰ انفسہم و لوکان بہم خصاصۃ۔"[۱] یعنی وہ دوسروں کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر ترجیح دیتے ہیں خواہ ان کی اپنی ضرورت کتنی ہی شدید کیوں نہ ہو۔

حضرت ابوالحسین نوریؒ کا قول ہے "نعت الفقیر السکون عند العدم والبذل و الایثار عند الوجود"[۲]۔ (فقیر کی صفت یہ ہے کہ اس کے پاس کچھ نہ ہو تو قانع رہے اور کچھ ہو تو بذل یعنی خرچ کرے اور ایثار سے کام لے۔) ایثار کا لغوی معنیٰ ہے ترجیح دینا، اصطلاحی مفہوم بیان ہو چکا ہے کہ دوسروں کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر ترجیح دینا، اور یہ واقعی قربانی کے مترادف ہے۔ چنانچہ رفتہ رفتہ فارسی اور اردو بلکہ خود عربی میں "ایثار" قربانی کا مفہوم ادا کرنے لگا۔

شیخ شہاب الدین سہروردی "عوارف المعارف" میں بذل اور ایثار کا فرق اس طرح واضح کرتے ہیں۔ "بذل۔ اول آنکہ در مقابلۂ بذلِ دیگر افتد و آنرا مکافاتِ خیر خوانند، دوم آنکہ برسبیلِ ابتدا و افتتاح بوَد با توقع مکافات و آنرا متأخرہ خوانند و ایں ہر دو قسم مرتبۂ عوام است، سوم آنکہ بر سبیل ابتدا بود، بے توقع مکافات و آنرا ایثار خوانند و ایں قسم مرتبۂ خواص است۔"[۳] — بذل کا معنیٰ ہے اول کسی سابقہ احسان کے بدلے میں خرچ کرنا، اسے مکافاتِ خیر

۱۔ سورہ ۵۹، آیت ۹۔
۲۔ التعرف، القاہرہ، ص ۹۶، کشف المحجوب۔ ص ۲۷۔
۳۔ مصباح الہدایت، فارسی ترجمۂ عوارف المعارف، شہاب الدین سہروردی نول کشور، ص ۲۷۳۔

کہتے ہیں ۔ دوم آئندہ کی کسی بھلائی کی توقع میں خرچ کرنا ، اسے متاخرہ کہتے ہیں اور یہ (دونوں طریق) عام آدمیوں کا شیوہ ہیں ۔ تیسری صورت ایثار ہے اور پہل کرنا ہے ، ضروری ہے کہ جواباً کوئی توقع وابستہ نہ کی جائے ، یہ خواص کا طریق ہے ۔

لیکن یہ خوئے ایثار کیونکر پیدا ہو ؟ فقراء کا خیال ہے کہ بے عشق الٰہی یہ رویہ نمودار نہیں ہوتا ۔ جب آدمی خود کو اللہ کا فقیر نہ جانے ، دنیا کی حرص و ہوس سے نجات نہیں پا سکتا ۔ حضرت قشیری کہتے ہیں ''افتقار الی اللہ یعنی اللہ کا فقیر ہو جانے کی کمترین علامت یہ ہے کہ اگر کسی شخص کے قبضے میں پوری کائنات ہو اور وہ اسے دوسروں کی خاطر ایک ہی دن میں صرف کر دینی پڑے تو کر دے ۔ اس وقت اگر اسے ذرا سا بھی خیال آئے کہ کم از کم ایک دن کا آذوقہ رکھ لینا چاہیے تھا تو گویا اسے فقر عطا نہیں ہوا ۔''[1]

حضرت بایزیدؒ فرماتے ہیں کہ مجھے جس طرح بلخ کے ایک نوجوان نے لاجواب کیا ایسا کبھی کسی نے نہ کیا تھا ۔ وہ حج پر نکلا ، ہم لوگوں سے بھی ملا اور مجھ سے پوچھنے لگا ''اے بایزید ! آپ کے یہاں 'زہد' کی انتہا کیا ہے ؟'' میں نے کہا ''جب مل جاتا ہے کھا لیتے ہیں ، کچھ نہ ملے تو صبر سے کام لیتے ہیں ۔'' وہ بولا ''ہمارے بلخ کے کتے بھی تو اسی طرح کرتے ہیں ۔'' چنانچہ میں نے پوچھا ''آپ کے یہاں زہد کی نہایت کیا ہے ؟'' بولا '' کچھ نہ ملے تو شکر کرتے ہیں ، کچھ مل جائے تو ایثار کرتے ہیں ۔''[2]

اس فقیری میں امیری اور امیری میں فقیری کے نظریے کی

۱- رسالۂ قشیریہ ، اردو ترجمہ ڈاکٹر پیر محمد حسن ، ص ۴۹۱ ۔

۲- عوارف المعارف ، عبدالقاہر بن عبداللہ السہروردی ، بیروت ، ص ۲۴۸ ۔

محکم اساس یہ اعتقاد ہے کہ درحقیقت آدمی کسی شے کا بھی مالک نہیں ، جو کچھ ہے خدا کا ہے اور آدمی کی جملہ متاع محض اللہ کی امانت ہے جو اسی کے حکم کے مطابق لوٹائی جانے والی ہے اور یہ احکام قرآن میں بالوضاحت بیان کر دیے گئے ہیں جہاں کہا گیا ہے کہ تمہاری دولت اور کمائی پر جملہ اہلِ حاجت کے حقوق ہیں ۔ وہ اہلِ حاجت غرباء ہیں ، مسافر ہیں ، یتامیٰ و مساکین ہیں ، قریبی تنگ، دست اعزہ ہیں ، وہ لوگ جو بظاہر کھاتے پیتے دکھائی دیتے ہیں اس لیے کہ رویہ بے نیازوں کا سا رکھتے ہیں مگر اندر سے بیچارے بالکل قلاش ہوتے ہیں ، و علیٰ ہٰذا ۔

شیخ شہاب الدین سہروردی صوفیہ میں پائے جانے والے، بلکہ تصوف کی لازمی شرط ، فقر کے بارے میں رقمطراز ہیں : فقرِ ایشاں صفت ذاتی بود کہ بوجود اسباب و عدم آں متغیر نشود ، اگر تقدیر مملکت عالم جملہ در حوزۂ تصرفِ ایشاں دہد ہمچناں خود را از تملکِ آں بری دانند ۔ واہل معنی در فضیلت فقر بر غنا و غنا بر فقر سخن رانده اند ، و مذہب صحیح آنست کہ با مُبتدیاں و متوسطاں فقر از غنا فاضل تر ، و نسبت با مُنتہاں ہر دو متساوی ، چہ صورتِ غنا ، معنیٔ فقر و حقیقت آں ، ازیشاں سلب نتواند کرد ، چنانکہ عبداللہ بن جلاء گفتہ است ''الفقران لا یکون لک فاذا لایکون لک من حیث لم یکن لک لم تکن لہ'' ۔

''فقر ان (صوفیہ) کی صفتِ ذاتی بن جاتی ہے ، ان کے پاس متاعِ دنیوی میں سے کچھ ہو یا نہ ہو مگر اس صفت میں کوئی تغیر رونما نہیں ہوتا ۔ دنیا بھر کے خزائن ان کی تحویل و تصرف میں دے دیے جائیں جب بھی وہ شعورِ ملکیت سے آزاد رہیں گے ۔

۱- مصباح الہدایت ۔ فارسی ترجمہ عوارف المعارف سہروردی (شیخ شہاب الدین) نول کشور ، ص ۲۹۷ ۔

اہلِ نظر نے دولت کو غربت اور غربت کو دولت پر ترجیح دی ہے ، اس لیے کہ ان کی نگاہوں میں دونوں یکساں ہیں ۔ تاہم مُبتدی اور متوسط لوگوں کے لیے ضروری ہے کہ فقر کو دولت پر ترجیح دیں اس لیے کہ فقط انہی لوگوں کے لیے جن کو فقر میں درجۂ کمال حاصل ہوچکا ہے دولت اور فقر میں فرق نہیں رہتا ، چنانچہ بڑے تموّل کے عالم میں بھی وہ مایۂ فقر سے محروم نہیں ہوتے ۔ عبداللہ بن جلاء کہتے ہیں ''فقر یہ ہے کہ تو کسی شے کا بھی مالک نہیں اور جب تو کسی شے کا مالک نہیں تو پھر کوئی شے تیری بھی مالک نہیں ۔''

یہی باعث ہے کہ ان کے نزدیک لائقِ احترام وہی لوگ تھے جو اللہ سے ڈرتے تھے ، پاکباز تھے ، صاحبِ ایثار تھے ۔ وہ کسی شخص کو اس کی دولت کے باعث لائقِ احترام نہ جانتے تھے ۔ حضرت قشیری حدیث نقل کرتے ہیں ''من تواضع لغنی لاجل غناہ ذھب ثلثا دینہ'' پھر اس حدیث کی وضاحت کے طور پر حضرت علی دقاق کے کلمات درج کیے ہیں ''اور یہ اس لیے کہ انسان نام ہے زبان ، دل اور نفس کا ۔ جب وہ اپنی زبان اور نفس سے اس (امیر آدمی) کے سامنے تواضع (اور اظہارِ عجز) کرتا ہے تو اس کا دو تہائی دین جاتا رہتا ہے اور اگر دل سے (بھی) اس کی فضلیت کو مانتا ہے جس طرح زبان اور نفس سے تو پھر اس کا سارا دین چلا جاتا ہے ۔''[1]

جبھی تو حضرتِ علامہ فرماتے ہیں ۔

حکمتِ دیں دل نوازی ہائے فقر　　قوتِ دیں بے نیازی ہائے فقر[2]

علامہ اقبال کے کلام کا مطالعہ ہمیں یہ باور کر لینے کا حوصلہ

۱- رسالہ قشریہ ، اردو ترجمہ ، ص ۳۲۱ ۔
۲- پس چہ باید کرد ، ص ۸۱۷/۲۱ ۔

دلاتا ہے کہ وہ ان خدا مست خادمانِ خلق کے افکار و احوال سے بخوبی آگاہ تھے - یہ خدا مست خادمانِ خلق جو دل کے پاک ، نیت کے بے لوث اور ارادے کے پکے تھے ، جو ملتِ مسلمہ کے عوام کا قبلہ و بارگاہ تھے اور امت کی قوت و اتحاد کے لیے ریڑھ کی ہڈی کا کام دیتے ، یہی وہ لوگ ہیں جن کی اہلِ اسلام کے دلوں پر حکومت تھی اور اس لیے تھی کہ وہ آزاد مرد تھے - امت کی نگاہوں میں ان کے احترام کا عالم یہ تھا کہ جو بادشاہ شیوخ کی بارگاہ پر حاضر ہوتا لوگوں کی نظروں میں اس کی عزت بڑھ جاتی تھی - اس کے برعکس شیوخ میں سے جو بادشاہوں ، وزیروں اور حاکموں کا خوشامدی ہوتا یا ان کی بارگاہوں میں آنے جانے کا شائق ہوتا ، اس کی عزت گھٹ جاتی تھی - حضرتِ علامہ نے کہا ہے -

چوں بہ کمال می رسد فقر دلیلِ خسروی است
مسندِ کیقباد را در تہِ بوریا طلب[1]

یہی مضمون اس قطعے میں بھی ہے -

خلافت ، فقر با تاج و سریر است
زہے دولت کہ پایاں ناپذیر است

جواں بختا ! مدہ از دست ایں فقر
کہ بے او پادشاہی زود میر است ![2]

بالِ جبریل کی نظم "مسجد قرطبہ" کے یہ شعر بھی اسی مضمون کے حامل ہیں -

آہ وہ مردانِ حق ! وہ عربی شہسوار
حاملِ "خلقِ عظیم"، صاحبِ صدق و یقیں

۱- زبور عجم ، ص ۱۱۵/۵۰۷ -
۲- ارمغان حجاز ، ص ۷۹/۹۶۱ -

جن کی حکومت سے ہے فاش یہ رمزِ غریب
سلطنتِ اہلِ دل ، فقر ہے شاہی نہیں!!

جیسا کہ پہلے عرض ہوا ''فقر'' کی منزل تک پہنچنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ، مگر امت کو بے لوث اہلِ عزم و ہمت اور اصحاب علم و بصیرت کی بہرحال شدید ضرورت ہے جو دوسروں کے لیے روشن مثال ہوں اور انسان کو مادی ہوس اور طمع کے بندھنوں سے کسی قدر آزاد رہنے کے سلسلے میں مدد دیں اور حق یہ ہے کہ امت کو ایسے افراد درجنوں بلکہ سینکڑوں اور ہزاروں میسر آئے اور ہر ملک میں میسر آئے - ان میں اعلیٰ درجے کے ادیب ، شاعر ، فقیہہ اور محدث و مفسر شامل رہے اور ان کے اوصافِ حمیدہ سے تذکرے بھرے پڑے ہیں -

مگر دلوں پر حکومت کرنے کی خاطر قول و فعل میں ہم آہنگی لازم ہے- آج کے دور کی سب سے بڑی بد قسمتی یہی ہے کہ ''اخلاق'' فکر و تامل کا مضمون بن کر رہ گیا ہے ، کردار و عمل سے اس کا واسطہ باقی نہیں رہا - نیکی اور بدی محض فلسفیانہ بحث ہے اور نیکی کی تلقین کرنے والے نیت اور قلب کی نیکی سے گریزاں ہیں - اول تو کھلم کھلا اپنے قول و فعل کی دھجیاں آڑاتے ہیں ورنہ کم از کم ''پرائیویٹ زندگی'' کو ضرور اپنے وعظ کی حدود سے خارج جانتے ہیں حالانکہ اخلاق و آدمیت زبان کی اور ذہن کی بات نہیں یہ قلب اور جان کی سوغات ہے -

یہ فقرائے امت ظاہر و باطن ایسا کر لیتے تھے کہ لوگ خود بخود ان کی طرف کھنچتے تھے - میں تو تاریخِ اسلام کے مطالعے سے اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ امت نے بادشاہوں کی ملازمت ضرور کی ہے ، آخر ہر نوع کی انتظامی ضروریات کا پورا ہونا لازم ہے ورنہ ''انارکی'' اور افراتفری پھیلتی ہے ، لیکن کسی حاکم کے زیرِ اقتدار انتظامی

۱- بال جبریل ، ص ۹۸/۳۹۰ -

یا دیگر امور مملکت میں معاون ہونا اور بات ہے اور اس ہیئت مقتدرہ کا عقیدت مند ہونا دوسرا مسئلہ ہے۔ حق یہ ہے کہ مسلمانوں کو قلبی عقیدت فقراء ہی سے رہی ہے۔ ان کی محبت کا کعبہ فقراء ہی کی بارگاہ رہی ہے۔ اس اعتبار سے دیکھیں تو یہ امت شاہ پسند نہیں، یہ فقر پسند امت ہے مگر وہ اہل فقر ہیں کہاں ؟ حضرتِ علامہ کی فریاد بھی یہی ہے۔

نہ ایران میں رہے باقی، نہ توران میں رہے باقی
وہ بندے فقر تھا جن کا ہلاکِ قیصر و کسریٰ[1]

حضرت ابوبکر وراق ترمذی فرماتے ہیں کہ ''لوگ تین قسم کے ہیں، ایک اُمراء، دوم علماء اور سوم فقراء۔ جب اُمراء بگڑ جائیں تو رعیت کی معاش اور کمائی بگڑ جاتی ہے، جب علماء بگڑ جاتے ہیں تو بندگی اور شریعت کے طریقے بگڑ جاتے ہیں اور جب فقراء بگڑ جائیں تو لوگوں کی عادات خراب ہو جاتی ہیں۔ اُمراء کا بگڑنا ظلم سے ہوتا ہے، علماء کا طمع سے اور فقراء کا ریا سے۔''[2] اور پھر جس سوسائٹی میں اہلِ حکم، اہلِ علم اور اہلِ فکر تینوں بگڑ جائیں ؟

ہم دیکھتے ہیں کہ علامہ اقبال بار بار اپنے معاصر صوفی و مُلا پر طنز و تعریض کرتے ہیں اور اس لیے کرتے ہیں کہ ان میں جرأتِ کردار نہیں، وہ یا محض دنیا دار ہیں یا محض خانقاہ نشین، جس کا مطلب ہے کہ یا وہ فقر کے معنیٰ نہیں جانتے یا اخلاص سے محروم ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ امت روحانی اور اخلاقی رہبری سے محروم

۱۔ بالِ جبریل، ص ۲۳/۳۱۵۔
۲۔ نفحات الانس، اردو ترجمہ نول کشور گیس پرنٹنگ پریس لاہور، ص ۱۴۰۔

ہوگئی اور پھر ژولیدہ فکر اور کوتاہ نظر ہو کر رہ گئی۔ چنانچہ انہوں نے کہا

شیر مردوں سے ہوا بیشۂ تحقیق تہی
رہ گئے صوفی و ملا کے غلام اے ساقی![1]

حضرت عبدالقاہر بن عبداللہ السہروردی فرماتے ہیں ''من لاینفعک لحظہ لاینفعک لفظہ۔''[2] (تجھے جس کی نگاہ کوئی فائدہ نہ دے اس کے لفظ بھی کوئی فائدہ نہ دیں گے)۔ مگر نگاہ میں مقناطیسیت تو قلب کی صفائی ہی سے آتی ہے، مستثنیٰ صورتوں کا معاملہ جُدا ہے، اکتسابِ جذب، حسنِ عمل کا محتاج ہے اور حسنِ عمل آنکھوں میں بجلی بن کر چمکتا ہے۔

نہیں فقر و سلطنت میں کوئی امتیاز ایسا
یہ سپہ کی تیغ بازی، وہ نگہ کی تیغ بازی![3]

فقط نگاہ سے ہوتا ہے فیصلہ دل کا
نہ ہو نگاہ میں شوخی تو دلبری کیا ہے![4]

تاریخِ اسلام ہمارے سامنے ہے، بلکہ جغرافیہ بھی، ہم دیکھتے ہیں کہ اُن علاقوں کے مسلمانوں کی تعداد جہاں مسلمان کبھی فاتحانہ یورش کر کے داخل نہیں ہوئے (مثلاً انڈونیشیا، ہند چینی، فلپائن، ملیشیا اور افریقہ کے بہت سے ممالک) ان علاقوں کے مسلمانوں سے کم نہیں جہاں مسلمان فاتحانہ داخل ہوئے اور بالقوہ حکمران رہے۔ آرنلڈ، ٹرمنگھم اور ہٹی وغیرہ بہت سے مغربی علماء و اہلِ تحقیق

۱- بال جبریل، ص ۱۲/۳۰۴ -
۲- عوارف المعارف، عبدالقاہر بن عبداللہ السہروردی، ص ۱۲۰ -
۳- بالِ جبریل، ص ۱۷/۳۰۹ -
۴- ایضاً ، ص ۴۸/۳۴۰ -

کو اعتراف ہے کہ ان غیر مفتوحہ و غیر محروسہ مسلم علاقوں میں اسلام محض اہلِ فقر کے باعث اور اہلِ تجارت کی بدولت پھیلا ۔ دراویش کا فقر بھی دلوں کو کھینچتا رہا اور تاجروں کا فقر بھی ۔ تاجروں کا فقر اس طرح کہ وہ ایثار سے کام لیتے تھے ، حرص اور بدمعاملگی سے مبرا تھے ، با امانت تھے ۔

خاکی و نوری نہاد ، بندۂ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی، اس کا دلِ بے نیاز[1]

لبِ لباب یہ کہ فقر ایک مزاج کا نام ہے اور وہ مزاج سر تا سر دلِ بے نیاز و غنی کی بخشش تھا ۔

آں فقر کہ بے تیغے صد کشورِ دل گیرد
از شوکتِ دارا بہ ، از فرِ فریدوں بہ[2]

۱- بالِ جبریل ، ص ۹۷/۳۸۹ ۔
۲- زبور عجم ، ص ۲۳/۵۱۵ ۔

قرآن کریم میں ملّت کا مفہوم

از : علامہ اقبال

جہاں تک میں دیکھ سکا ہوں قرآن حکیم میں جہاں جہاں اتباع و شرکت کی دعوت ہے وہاں صرف لفظ ملت یا اُمت وارد ہوا ہے - کسی خاص قوم کے اتباع یا اس میں شرکت کی دعوت نہیں - مثلاً ارشاد ہوتا ہے :

ومن احسن دیناً لمن السلم وجہ اللہ وھو محسن واتبع ملت ابراھیم حنیفاً و اتبعت ملت ابائی ابراھیم فاتبعوا ملت ابراھیم حنیفاً ؕ

اور یہ اتباع و اطاعت کی دعوت اس لیے ہے کہ ملت نام ہے ایک دین کا ، ایک شرع و منہاج کا -

قوم چونکہ کوئی شرع و دین نہیں ہے اس لیے اس کی طرف دعوت اور اس سے تمسک کی ترغیب عبث تھی - کوئی گروہ ہو ، خواہ وہ قبیلہ کا ہو ، نسل کا ہو ، ڈاکوؤں کا ہو ، جغرافیائی اعتبار سے ایک ملک یا وطن والوں کا ہو ، وہ محض گروہ ہے رجال کا ، انسانوں کا - وحی الٰہی یا نبی کے نقطۂ خیال سے ابھی وہ گروہ ہدایت یافتہ نہیں ہوتا اگر وہ وحی یا نبی اس گروہ میں آئے ، تو وہ اس کا پہلا مخاطب ہوتا ہے ، اس لیے اس کی طرف منسوب بھی ہوتا ہے - قوم نوح[۴] ، قوم موسیٰ[۴] ، قوم لوط[۴] ، لیکن اگر اسی گروہ کا مقتدا کوئی بادشاہ ہو یا سردار ہو ، تو وہ اس کی طرف بھی منسوب

ہوگا ۔ مثلاً قومِ عاد ، قومِ فرعون ۔ اگر ایک ملک میں دو گروہ اکٹھے ہو جائیں اور اگر وہ متضاد قسم کے رہنماؤں کے گروہ ہوں ، تو وہ دونوں سے منسوب ہو سکتے ہیں ۔ مثلاً جہاں قومِ موسیٰ تھی ، وہاں قومِ فرعون بھی تھی قال الملاء من قوم فرعون انتم موسیٰ و قومہ ۔

لیکن ہر مقام پر جہاں قوم کہا گیا وہاں وہ گروہ مخاطب تھا جو ابھی ہدایت یافتہ اور غیر ہدایت یافتہ سب افراد پر مشتمل تھا ۔ جو افراد پیغمبر کی متابعت میں آتے گئے ، توحید تسلیم کرتے گئے ، وہ پیغمبر کی ملت میں آ گئے ، ان کے دین میں آ گئے یا واضح تر معنوں میں مسلم ہوگئے ۔ یاد رہے کہ دین اور ملت کفار کی بھی ہوتی ہے ۔ انی ترکت ملة قوم لا یؤمنون باللہ ایک قوم کی ایک ملت یا اس کا منہاج تو ہو سکتا ہے لیکن ملت کی قوم کہیں نہیں آیا ۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ خدا نے قرآن میں ایسے افراد کو جو مختلف اقوام اور ملل سے نکل کر ملتِ ابراہیمی میں داخل ہوگئے ان کو داخل ہونے کے بعد لفظِ قوم سے تعبیر نہیں کیا بلکہ اُمت کے لفظ سے ۔

بنی نوع آدم کی تقسیم

ان گزارشات سے میرا مقصد یہ ہے کہ جہاں تک میں دیکھ سکا ہوں قرآن کریم میں مسلمانوں کے لیے اُمت کے سوا اور کوئی لفظ نہیں آیا ۔ اگر کہیں آیا ہو تو ارشاد فرمائیے ، قوم رجال کی جماعت کا نام ہے اور یہ جماعت باعتبار قبیلہ ، نسل ، رنگ ، زبان ، وطن اور اخلاق ہزار جگہ اور ہزار رنگ میں پیدا ہو سکتی ہے لیکن ملت سب جماعتوں کو تراش کر ایک نیا اور مشترک گروہ بنائے گی ۔ گویا ملت یا اُمت جاذب ہے اقوام کی ، خود ان میں جذب نہیں ہو سکتی ۔

عہد ِ حاضر کے ہندوستان کے علماء کو حالات زمانہ نے وہ باتیں کرنے اور دین کی ایسی تاویلیں کرنے پر مجبور کر دیا ہے جو قرآن یا نبی ِ آمی ؐ کا منشاء ہرگز نہ ہو سکتی تھی ۔ کون نہیں جانتا کہ حضرت ابراہیم ؑ سب سے پہلے پیغمبر تھے جن کی وحی میں قوموں ، نسلوں اور وطنوں کو بالائے طاق رکھا گیا ۔ بنی نوع آدم کی صرف ایک تقسیم کی گئی ۔ موحد و مشرک اس وقت سے لے کر دو ہی ملّتیں دنیا میں ہیں ، تیسری کوئی ملت نہیں ۔ کعبۃ اللہ کے محافظ آج دعوت ابراہیمی اور دعوت ِ اسمٰعیلی سے غافل ہو گئے ۔ قوم اور ملت کی ردا اوڑھنے والوں کو اس ملت کے بانیوں کی وہ دعا یاد نہ آئی جو اللہ کے گھر کی بنیاد رکھتے وقت ان دونوں پیغمبروں نے کی و اذ یرفع ابراھیم القواعد من البیت و اسمٰعیل ط ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم ۔ ربنا و جعلنا مسلمین لک و من ذریتنآ آمة مسلمة لک ۔

الکفرة ملة واحدة

کیا خدا کی بارگاہ سے اُمت مسلمہ کا نام رکھوانے کے بعد بھی یہ گنجائش باقی تھی کہ آپ ؐ کی ہیئت ِ اجتماعی کا کوئی حصہ کسی عربی ، ایرانی ، افغانی ، انگریزی ، مصری یا ہندی قومیت میں جذب ہو سکتا ہے ۔ اُمت ِ مسلمہ کے مقابل میں تو صرف ایک ہی اُمت ہے اور الکفرہ ملة واحدة کی ہے ۔

اُمت ِ مسلمہ جس دین ِ فطرت کی حامل ہے اس کا نام دین ِ قیّم ہے ۔ دین ِ قیّم کے الفاظ میں ایک عجیب و غریب لطیفہ مخفی ہے اور وہ یہ کہ صرف دین ہی مقوم ہے اس گروہ کے امور معاشی اور معاوی کا جو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی اس کے نظام کے سپرد کر دے ۔ بالفاظ دیگر یہ کہ قرآن کی رُو سے حقیقی ، تمدنی یا سیاسی معنوں میں قوم ، دین اسلام ِ سے ہی تقویم پاتی ہے ، یہی وجہ ہے کہ قرآن صاف صاف اس حقیقت کا اعلان کرتا ہے کہ

کوئی دستور العمل جو غیر اسلام ہونا مقبول و مردود ہے۔

ایک اور لطیف نکتہ بھی مسلمانوں کے لیے قابلِ غور ہے کہ اگر ''وطنیت'' کا جذبہ ایسا ہی اہم اور قابلِ قدر تھا، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض اقارب اور ہم نسلوں اور ہم قوموں کو آپ سے پرخاش کیوں ہوئی، کیوں نہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کو محض ایک ہمہ گیر معمولی ملت سمجھ کر بلحاظ قوم یا قومیت ابوجہل اور ابولہب کو اپنا بنائے رکھا اور ان کی دلجوئی کرتے رہے۔ بلکہ کیوں نہ عرب کے سیاسی امور میں اُن کے ساتھ قومیت وطنی قائم رکھی۔ اگر اسلام سے مطلق آزادی مراد تھی، تو آزادی کا نصب العین تو قریش مکہ کا بھی تھا مگر افسوس کہ آپ اس نکتہ پر غور نہیں فرماتے کہ پیغمبرؐ خدا کے نزدیک اسلام دین قیّم، اُمتِ مسلمہ کی آزادی مقصود تھی۔ ان کو چھوڑ دیا، ان کو کسی دوسری ہیئتِ اجتماعیہ کے تابع رکھ کر کوئی اور آزادی چاہنا بے معنی تھا۔ ابوجہل اور ابو لہب اُمتِ مسلمہ کو ہی آزادی سے پھلتا پھولتا نہیں دیکھ سکتے تھے کہ بطور مدافعت ان سے نزاع درپیش آئی۔ محمدؐ (فداہ اُمی ابی) کی قوم آپ کی بعثت سے پہلے قوم تھی، اور آزاد تھی، لیکن جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت بننے لگی تو اب قوم کی حیثیت ثانوی رہ گئی۔ جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت میں آ گئے، وہ خواہ ان کی قوم سے تھے یا دیگر اقوام سے، وہ سب اُمتِ مسلمہ یا ملّتِ محمدیہ بن گئے۔ پہلے وہ ملک و نسب کے گرفتار تھے، اب ملک و نسب کے گرفتار تھے، اب ملک و نسب ان کا گرفتار ہو گیا۔

کسے کہ پنجہ زد ملک و نسب را \
نہ داند نکتۂ دینِ عرب را \
اگر قوم از وطن بودے محمدؐ \
نہ دادے دعوتِ دیں بولہب را

—:o:—

اشاریہ

- اشخاص
- مقامات و ادارے
- کتب و رسائل
- افکار و نظریات

اشخاص

آ

آرنلڈ : ۲۱۷ -

آذر : ۷۶ -

الف

ابراہیمؑ ، حضرت ، خلیل : ۷۱ ، ۷۳ ، ۷۶ ، ۷۷ ، ۷۸ ، ۷۹ ، ۸۰ ، ۸۲ ، ۸۴ ، ۸۵ ، ۸۶ ، ۸۷ ، ۸۸ ، ۹۲ ، ۹۳ -

ابراہیم بن فاتکؓ ، حضرت : ۸۱ -

ابن بطوطہ : ۱۴۵ ، ۱۴۹ -

ابن تومرت : ۱۴۸ -

ابن جبیر : ۱۴۵ -

ابن طفیل : ۱۴۸ -

ابن قیّم ، امام : ۹۹ -

ابن ماجہ : ۱۴۸ -

ابن مسکویہ : ۵۷ ، ۷۰ -

ابوالحسن نوری ، حضرت : ۲۱۰ -

ابوبکر صدیقؓ ، حضرت : ۱۳۳ ، ۱۹۳ -

ابوبکر وراق ، حضرت : ۲۱۶ -

ابوجعفر بن سعید ، حضرت : ۱۷۶ -

ابوجہل : ۱۳۰ ، ۱۶۱ ، ۱۶۲ -

ابوحذیفہ : ۱۳۳ -

ابو سعید ابوالخیر ، شیخ : ۱۰ -

ابو سفیان : ۱۸۵ -

ابو طالب کلیم : ۲۲ ، ۲۳ -

ابوعبیدہؓ : ۱۳۲ -

ابولہب (بولہب) : ۴۲ ، ۴۳ ، ۱۳۱ ، ۱۳۳ -

ابونصر فارابی : ۱۱۶ (ح) -

اتریا ، بی - ایل ، پروفیسر -
Atreya, B.L., Prof.)
۱۱۰ ، ۱۱۱ -

احمد بن حواری : ۲۰۶ -

احمد شوق : ۱۶۷ -

اسلم - ایم : ۱۰۰ -

اسمٰعیلؑ : ۳۶ ، ۷۶ ، ۹۳ -

اصحابِ صفہ : ۲۰۸ -

افلاطون : ۱۰۲ -

اقبال ، علامہ ، ڈاکٹر : ۱ ، ۲ ،

۵ ، ۶ ، ۷ ، ۸ ، ۱۲ ، ۱۵ ،
۱۸ ، ۲۰ ، ۲۳ ، ۲۴ ، ۲۵ ،
۲۶ ، ۲۷ ، ۲۸ ، ۲۹ ، ۳۰ ،
۳۵ ، ۴۳ ، ۴۴ ، ۴۷ ، ۴۸ ،
۵۴ ، ۵۸ ، ۶۰ ، ۶۱ ، ۶۲ ،
۶۶ ، ۶۸ ، ۷۱ ، ۷۲ ، ۷۴ ،
۷۶ ، ۷۸ ، ۷۹ ، ۸۰ ، ۸۱ ،
۸۴ ، ۸۵ ، ۸۶ ، ۸۷ ، ۸۸ ،
۸۹ ، ۹۰ ، ۹۱ ، ۹۲ ، ۹۳ ، ۹۵ ،
۱۰۰ ، ۱۰۴ ، ۱۰۵ ، ۱۰۶ ،
۱۰۷ ، ۱۰۸ ، ۱۰۹ ، ۱۱۰ ،
۱۱۱ ، ۱۱۲ ، ۱۱۳ ، ۱۱۴ ،
۱۱۵ ، ۱۱۶ ، ۱۱۸ ، ۱۲۲ ،
۱۲۵ ، ۱۲۶ ، ۱۲۷ ، ۱۲۸ ،
۱۲۹ ، ۱۳۱ ، ۱۳۳ ، ۱۳۴ ،
۱۳۵ ۱۳۶ ، ۱۳۷ ، ۱۳۸ ،
۱۴۱ ، ۱۴۲ ، ۱۴۴ ، ۱۴۵ ،
۱۴۶ ، ۱۵۱ ، ۱۵۴ ، ۱۵۶ ،
۱۵۷ ، ۱۵۸ ، ۱۵۹ ، ۱۶۰ ،
۱۶۱ ، ۱۶۲ ، ۱۶۴ ، ۱۶۵ ،
۱۶۸ ، ۱۷۱ ، ۱۷۲ ، ۱۷۴ ،
۱۷۵ ، ۱۷۷ ، ۱۷۹ ، ۱۸۳ ،
۱۸۶ ، ۱۸۷ ، ۱۸۸ ، ۱۸۹ ،
۱۹۱ ، ۱۹۴ ، ۱۹۸ ، ۲۰۰ ،
۲۰۱ ، ۲۰۳ ، ۲۰۵ ، ۲۰۸ ،
۲۰۹ ، ۲۱۳ ، ۲۱۶ ، ۲۱۷ -

اکبر ، شہنشاہ : ۳۳ -
اکبر ، (الہ آبادی) ، حضرت : ۳۵ ، ۲۰۳ -
البیرونی ، ابو الریحان : ۱۲۷ -
الظنون (صاحبِ کشف) : ۳۱ -
اوڈیس : ۱۰۳ -
ایلیٹ سمتھ ، جی - ای : ۹۸ -
ایوب[۴] ، حضرت : ۲۰۹ -

ب

بایزید بسطامی : ۲۰۶ ، ۲۱۱ -
بٹلر : ۱۳ -
براڈ ، سی - ڈی - ۱۰۰ -
بریسٹڈ ، جے - ایچ (Breasted J.H.) ۹۷ ، ۹۸ -
بسمارک ، (بروک بانڈ لمیٹڈ) : ۱۵۱ ،
بلال حبشی : ۱۳۱ ، ۱۳۳ ، ۱۶۱ -
نیسلے : ۲ -
بنو امیہ : ۱۳۸ -
بنو عباس : ۱۳۸ ، ۱۷۶ -
بنی اسرائیل : ۱۸۱ -
بو الحسن : ۱۱۹ -
بو علی سینا : ۱۰ ، ۱۱ -
بہار ، ملک الشعراء : ۱۳۶ -
بُھٹہ ، مظفر احمد (بروک بانڈ لمیٹڈ) : ۲ -

پ

پارنیاں : ۱۲۳ -
پرائس : ۱۲۳ -
پورٹر ڈبلیو ، ای (Porter W.E.) : ۳۷ -

پیر محمد احسن ، ڈاکٹر : ۲۱۱ (ح) -

ت

ترمنگھم : ۲۱۷ -

ٹ

ٹیگور : ۱۳۶ -

ج

جامی ، مولانا : ۱۸ -
جبریل امیں (روح الامیں) : ۴ ، ۱۴۵ ، ۱۸۴ -
جرّاح : ۱۳۲ -
جفریز ، ایم - وی - سی
Jaffreys M.V.C.
۲۳ (ح) ، ۴۰ (ح) -
جمال الدین افغانی : ۱۵۶ ، ۱۵۷ -
جنید بغدادی ، حضرت : ۳۲ ، ۲۰۲ ، ۲۰۶ -
جہانگیر (شہنشاہ) : ۳۳ ، ۱۰۳ -

ح

حافظ (شیرازی) ، حضرت : ۱۶۱ -
حالی ، مولانا : ۱۷۳ ، ۲۰۳ -
حسن رض (امام) : ۱۶۱ -
حسن بصری ، حضرت : ۳۲ -
حسین احمد مدنی ، مولانا : ۱۶۱ ، ۱۶۲ -
حکم بن سعید بن العاص : ۱۳۲ -
حیدر کرّار : ۱۵۹ -
ہیسوآڈ (Hesoid) : ۴۱ -

خ

خسرو : ۹۶ -

د

داتا گنج بخش ، حضرت (علی ہجویری) : ۳۲، ۲۰۲ ، ۲۰۷ ، ۲۰۹ -
دارا : ۲۰۸ -
داغ : ۲۰۳ -
دانیال : ۱ -
درانی ، ایف - کے
(Durrani, F. K.)
۱۳۵ -

ڈ

ڈورانٹ ، ول (Durant, Will) : ۴۱ -
ڈیوی ، (Dewy) : ۳۴ (ح) -

ذ

ذوق : ۹۶ -

ر

رادھا کرشنن ، ڈاکٹر : ۹۹ -
رازی ، محمد صادق : ۲۳ ، ۲۴ (ح) ، ۲۰۳ -
راما نوج : ۹۹ -
رحمٰن ، ایس - اے ، ڈاکٹر (ڈاکٹر ایس اے رحمٰن) : ۱ ، ۲ ، ۵ ، ۸ -
رسول اکرم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم : ۸ ، ۱۱ ، ۳۲ ،

۴۲ ، ۴۳ ، ۶۰ ، ۶۴ ، ۱۲۵ ،
۱۲۶ ، ۱۳۱ ، ۱۳۲ ، ۱۳۳ ،
۱۳۴ ، ۱۳۶ ، ۱۴۱ ، ۱۴۲ ،
۱۶۱ ، ۱۶۳ ، ۱۶۹ ، ۱۷۴ ،
۱۸۴ ، ۱۸۹ ، ۱۹۰ ، ۱۹۴ ،
۱۹۸ ، ۱۹۹ ، ۲۰۰ ، ۲۰۴ ،
۲۰۵ ، ۲۰۶ ، ۲۰۷ -
رشید رضا : ۱۵۷ -
رؤف : ۱ -
رومی (روم ، مولانا جلال الدین) :
۱۲ ، ۲۴ ، ۲۰۳ -

ز

زکی علی ، ڈاکٹر (ترکی) : ۱۳۷ ،
۱۴۲ -
زینب رض ، حضرت : ۱۳۲ -

س

سی فس : ۱۰۳ -
سعدی ، شیخ : ۱۰۵ ، ۱۴۸ -
سقراط : ۶۱ ، ۱۰۲ ، ۱۷۳ -
سلمان فارسی رض ، حضرت : ۱۳۱ ،
۱۳۳ ، ۲۸۰ ، ۲۰۹ -
سلطان عثمانی : ۱۵۰ -
سلیمان علیہ السلام ، حضرت :
۲۰۸ ، ۲۰۹ ، ۲۱۰ -
سمتھ، ڈبلیو - سی (Smith W.C.) :
۱۳۹ ، ۱۴۰ ، ۱۵۰ ، ۱۵۷ ،
۱۵۸ ، ۱۶۴ -
سنوسی : ۱۵۶ -
سوامی تیرتھ : ۹۷ -
سیزر : ۱۵۱ -
سین ، این - بی (Sen, N.B.) :
۸۰ (ح) -

ش

شا، ڈسمونڈ (Shaw, Desmond) :
۱۰۰ -
شبلی (شبلی نعمانی ، علامہ) : ۵ -
شنکر اچاریہ : ۹۹ -
شہاب الدین سہروردی ، حضرت :
۳۲ ، ۶۵ ، ۲۱۰ ، ۲۱۲ (ح) -
شیکسپیئر : ۱۱۲ -
شاہ فیصل شہید : ۱۶۵ -

ص

صالح السامرانی : ۱۵۰ -
صفدر محمود ، ڈاکٹر : ۱ -
صلاح الدین : ۱۵۰ -
صہیب رومی : ۱۳۱ ، ۱۶۱ -

ط

طارق ، اظہر جاوید : ۱ -
طنجہ : ۱۴۹ -

ع

عالمگیر ، تیموری : ۱۵۰ -
عباس بن عبدالمطلب ۱۳۲ -
عبدالرحمٰن (ابن حضرت ابوبکر
صدیق رض) : ۱۳۳ -

عبدالشکور ، شیخ : ۱ -
عبدالقادر بیدل ، حضرت : ۱۷ -
عبدالقادر جیلانی (محی الدین عبدالقادر جیلانی) ، شیخ : ۱۳، ۳۲ ، ۱۸۷ ، ۲۰۰ ، ۲۰۵ -
عبدالقاہر بن عبداللہ السہروردی : ۳۶ (ح)، ۶۵ ، ۲۱۱، ۲۱۷ -
عبدالکریم الخطیب ، الاستاذ : ۵۹ -
عبدالوہاب عظام : ۱۳۶ -
عبداللہ انصاری ، شیخ الاسلام : ۸۱ -
عبداللہ بن جلاح : ۲۱۲ -
عبدالہادی ، شیخ : ۲۰۷ -
عبیدہ بن سعید بن العاص : ۱۳۲ -
عتبہ بن ربیعہ : ۱۳۳ -
عدی امین : ۱۶۵ -
عرشی ، محمد حسین : ۱۱۵ -
عقیل : ۱۳۲ -
علاء الدین خلجی ، سلطان : ۳۳ -
علی کرم اللہ وجہہ ، حضرت : ۱۳۱ ، ۲۰۱ -
علی حزیں ، شیخ : ۱۷۹ -
علی وفاق ، حضرت ، ۲۰۳ -
عمر (فاروق رض) ، حضرت : ۱۳۲ ، ۱۶۵ -
عیسٰی علیہ السلام ، مسیح ؑ ، حضرت : ۷۹ ، ۱۱۱ -

غ

غالب ، (مرزا) : ۸ ، ۱۶ ، ۷۵ ، ۹۶ -
غزالی ، امام : ۱۱۰ ، ۱۱۸ ، ۱۴۸ -

ف

فاطمہ الزہرا (بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) ، حضرت : ۱۹۹ -
فریدون : ۲۱۸ -
فضل حسین ، سر : ۱۰۵ -

ق

قزوینی : ۶۷ -
قشیری ، حضرت : ۲۱۱ ، ۲۱۳ -
قیصر و کسریٰ : ۲۱۶ -

ک

کاشانی : ۱۵۶ -
کانٹ : ۱۱۱ -
کلیم (حضرت موسیٰ) : ۳۰ ، ۷۹ -
کلے (محمد علی) : ۱۵۰ -
کیقباد : ۹۶ ، ۲۱۴ -

گ

گب (ہملٹن ، سر) : ۱۴۰ -

ل

لاسکی (پروفیسر) : ۱۲۳ -
لیلی : ۸۸ -

لی کمپٹے (Le Compte) : ۱۷ (ح) ، ۱۸ -
لینن : ۲۰ -

م

مامون (الرشید ، خلیفہ : ۳۳ -
متوکل (خلیفہ) : ۳۳ -
مجدد الف ثانی ، شیخ سرہندی ، حضرت : ۳۳ ، ۲۰۷ -
محمد اسد : ۱۵۳ -
محمد اسد طلس ، ڈاکٹر : ۳۴ -
محمد اکرم ، رانا : ۲ -
محمد بن قاسم : ۱۳۹ -
محمد تغلق سلطان : ۳۳ ، ۱۳۹ -
محمد خورشید عاصم : ۱
محمد سہیل عمر : ۱ -
محمد صدیق شبلی ، ڈاکٹر : ۱ -
محمد عاکف : ۱۳۶ -
محمد عبداللہ ، شیخ : ۱۵۷ -
محمد منور ، پروفیسر (مصنف) : ۳ ، ۶ ، ۸ -
محمود عقاد : ۶۷ (ح) ، ۱۱۶ -
محمود غزنوی (سلطان) : ۱۳۶ ، ۱۳۹ -
محمود نظامی : ۱۱۵ (ح) -
مصطفیٰ الکیک : ۵۹ ، ۱۰۰ -
مصطفیٰ خاں شیفتہ ، نواب : ۱۸۹ -
معری ، ابو العلا : ۶۲ -
منصور حلاج : ۹۷ -
مورس گاڈفرے ممبتیز (Maurice Gaudfrey Mumbnes) ۱۳۷ -
موسیٰ[۴] ، (کلیم) حضرت : ۳۰ -
منظور عباسی : ۱۱۲ -
مہدی سوڈانی : ۱۵۶ -
میر تقی میر : ۱۸۳ ، ۱۹۹ -
مینی پس (Mennipus) : ۴۱ -

ن

نذیر نیازی ، سید : ۱۵۶ ، ۱۶۲ ، ۱۶۳ -
نطشے : ۴۹ -
نظام الدین اولیا ، خواجہ : حضرت : ۱۰ -
نظام الملک : ۳۴ -
نظیری : ۱ ، ۲ -
نمرود : ۸۲ ، ۹۳ -
نوح ، علیہ السلام ، حضرت : ۱۸۰ -
نہرو ، جواہر لال : ۱۳۰ -
نیپولین : ۱۵۱ -
نیرو : ۱۱۱ -

و

واشنگٹن (صدر امریکہ) : ۱۱۱ -
ولی اللہ ، شاہ (شاہ ولی اللہ) :
۱۱۰ ، ۱۱۹ ، ۱۵۷ -

ہ

ہل (پروفیسر) : ۱۲۳ -
ہوم : ۸۱ ، ۱۰۲ -
ہیسیڈ : ۱۰۳ -
ہیگل : ۱۲۳ ، ۱۶۰ -
ہیٹی (پروفیسر) : ۲۱۷ -

ی

یوسف بن تاشقین : ۱۴۹ -

---:o:---

مقامات ۔ ادارے

الف

ادارۂ اقوام (اقوام متحدہ U.N.O
جمیعۃ اقوام) : ۱۸ ، ۱۹ ،
۱۴۱ ، ۱۴۲ ، ۱۴۳ ، ۱۴۴ ،
۱۵۳ -
احزاب ، غزوہ : ۱۸۵ :
اری ٹیریا : ۱۴۳ -
اسرائیلی نسل : ۱۲۴ -
افریقہ : ۵، ۱۳۸، ۱۴۳ ، ۱۴۸ ،
۲۱۷ -
افغانستان : ۱۳۴ -
المغرب : ۱۴۸ -
امریکہ : ۱۷، ۲۷ ، ۳۷ ، ۱۰۰ ،
۱۲۳ ، ۱۲۴ ، ۱۳۰ ، ۱۵۰ -
اندلس (سپین ، ہسپانیہ) : ۱۳۸ ،
۱۴۴ ، ۱۴۷ ، ۱۴۸ -
انڈونیشیا : ۱۵۶ ، ۲۱۷ -
اٹلی : ۱۲۳ ، ۱۵۱ -
ایران : ۵ ، ۱۳۴ ، ۱۳۶، ۱۵۶،
۱۵۷ ، ۲۱۶ -
ایشیا : ۵، ۳۴ -

ب

بدر ، غزوہ : ۱۳۲ ، ۱۳۳ -
بحر (بحر الکاہل ، بحر ہند ، بحیرہ
عرب) : ۱۴۸ -
بخارا : ۱۴۴ -
برزخ : ۱۰۹ ، ۱۱۲ ، ۱۱۴ ،
۱۱۵ ، ۱۱۷ ، ۱۱۸ -
برطانیہ (انگلستان) : ۱۲۳، ۱۵۱ -
بروک بانڈ پاکستان لمیٹڈ : ۲ -
بصرہ : ۱۶۱ -
بغداد : ۳۴ ، ۴۸ -
بلخ : ۲۱۱ -
بھارت : ۹۹ ، ۱۰۰، ۱۱۱ (ح) ،
۱۴۳ -
بیت اللہ (بیت الحرام ، حرم) :
۴ ، ۱۴۱ ، ۱۴۴ ، ۱۴۵ ،
۱۴۶ -
بیروت : ۳۶ (ح) ، ۵۷ (ح) ،
۶۶ (ح) ، ۷۰ (ح) ، ۱۱۶
(ح) ، ۱۱۸ (ح) ، ۲۱۱ (ح) -

پ

پاکستان : ۲ ، ۸، ۱۴۳، ۱۴۹ -

۱۵۳ (ح) -
پاکستان (مغربی، مشرق) : ۱۴۶، ۱۵۱ -
پاک و ہند بر اعظم (برصغیر، برعظیم) : ۵۴، ۱۳۶، ۱۵۲، ۱۵۸، ۱۶۰، ۱۶۳ -
پنجاب : ۱۶۲ -
پین اسلامزم : ۱۵۷، ۱۵۸ -

ت

تجارتی ادارے (اہل تجارت) : ۳، ۲۱۸ -
ترکستان : ۱۲۵ -
ترکی (ٹرکی) : ۵، ۱۳۴، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۵۷ -
توران : ۲۱۶ -

ٹ

ٹرائے : ۱۰۳ -
ٹمبکٹو : ۱۴۴ -

ج

جدہ : ۱۶۵ -
جرمنی : ۱۲۳، ۱۵۱ -
جہانِ آدم : ۲۳ -
جنیوا : ۱۴۱، ۱۴۲ -

چ

چین : ۱۳۴، ۱۴۹ -

ح

حبشہ : ۱۴۳، ۱۶۱ -
حجاز : ۲۰۴ -
حج : ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۲۱۱ -
حلقہ ہائے درس (مدرسہ، مکتب، خانقاہ) : ۲۵، ۳۱، ۳۲، ۹۳، ۱۴۷، ۱۴۸، ۲۰۷، ۲۱۶ -

خ

خراسان : ۳۴ -
خلافت (اسلامی سلطنت) : ۱۳۱، ۱۳۸ -
خلیج بنگال : ۱۴۸ -
خیبر : ۱۵۹ -

د

دمشق : ۱۴۸ -
دیوبند : ۱۶۱، ۱۶۲ -

ر

رائل فلاسوفیکل سوسائٹی گلاسگو Royal Philosophical Society Glosgow : ۹۸ -
رباط : ۱۶۴ -
روس : ۱۴۳ -
روم : ۱۶۱، ۱۹۵ -

س

سدّوم بستیاں : ۲۲ -

سمرقند : ۱۴۴ -
سنسار چکرم : ۹۹ -
سوڈان : ۱۵٦ -
سوئٹزرلینڈ : ۱۲۳ -
سویڈن : ۱۲۵ -
سینا : ۷۹ ، ۱۳۹ -

ش

شام : ۱۵۷ ، ۱۹۵ -

ط

طور ، وادی : ۳۰ ، ۷۹ ، ۸۸ -

ع

عالم (انسانیت ، امر ، خلق ، ارواح) : ۲۳ ، ٦۴ ، ٦۵ ، ٦۷ ، ۱۰۰ -
عالم اسلام : ۱۴۵ ، ۱۴٦ ، ۱۴۷ ، ۱۴۸ ، ۱۴۹ ، ۱۵۰ ، ۱۵۱ ، ۱۵۴ ، ۱۵٦ ، ۱۵۷ ، ۱۵۸ ، ۱٦۰ -
عجم ، ۲۳ ، ۴۳ ، ۱۳٦ ، ۱۴۴ ، ۱٦۱ -
عرب : ۲۳ ، ۴۳ ، ۱۲۵ ، ۱۳۴ ، ۱۳٦ ، ۱۴۴ ، ۱۴۵ ، ۱۵۷ ، ۱۹۹ -

ف

فاک لینڈ : ۱۲۵ -
فرانس : ۱۵۱ -
فرنگ : ۲٦ ، ۲۷ ، ۳۰ ، ۳۱ ، ۱۴۴ -
فلپائن : ۲۱۷ -
فلسطین : ۱٦۲ -

ق

قاہرہ : ۲۰٦ -
قرطبہ : ۱۳۹ -
قسطنطنیہ : ۱۱۷ -

ک

کاشغر : ۱۴۸ -
کراچی : ۱۱۲ (ح) -
کشمیر : ۱۵۳ -
کعبہ : ٦ ، ۱٦ ، ۵۲ ، ٦٦ ، ۷٦ ، ۱۴٦ ، ۲۱٦ -
کوریا : ۱۲۵ -
کینیڈا : ۱۲۳ -

گ

گلاسگو : ۹۸ -
گنگا دریا : ۸۰ -

ل

لاہور : ۳ ، ۱۰ (ح) ، ۱۰۰ ، ۱۱۵ (ح) ، ۱۴٦ ، ۱۵۰ ، ۱٦۴ ، ۲۰۰ ، ۲۰۲ ، ۲۰۸ (ح) ، ۲۰۹ (ح) ، ۲۱٦ (ح) -
لائل پور : ۱۵۰ -
لندن : ۹۹ ، ۱۴۰ -
لیبیا : ۱۵٦ -

م

مالی ، ماریتانیا : ۱۴۷ -
مدائن : ۲۰۹ -
مدینہ : ۱۳۱ ، ۱۳۲ ، ۱۶۳ ، ۱۸۵ -
مراکش : ۵ ، ۱۴۸ ، ۱۴۹ -
مسلم علاقہ : ۲۱۸ -
مصر : ۱۱ (ح) ، ۱۳ (ح) ، ۵۹ (ح)، ۹۷ (ح) ، ۱۰۰ ، ۱۳۶ ، ۱۴۸ ، ۱۵۲ ، ۱۶۷ -
ملتان : ۱۳۹ -
ملیشیا : ۲۱۷ -
مکہ : ۲۲ ، ۳۲ ، ۴۲ ، ۱۲۶ ، ۱۳۲ ، ۱۴۲ ، ۱۴۳ ، ۱۴۴ ، ۱۵۷ ، ۱۶۱ ، ۱۶۲ ، ۱۶۳ ، ۱۸۵ -
منگولیا : ۱۴۷ -
موتمر عالم اسلام : ۱۶۴ -

ن

نیشا پور : ۱۴۴ ، ۱۴۸ -
نیل (دریا) : ۱۴۸ -

ہ

ہند چینی : ۲۱۷ -
ہندوستان (متحدہ) : ۱۳۴ ، ۱۳۵ ، ۱۴۹ ، ۱۵۷ -
ہنگری : ۱۲۴ -

ی

یوروپ : ۲۰ ، ۲۱ ، ۲۷ ، ۳۰ ، ۳۸ ، ۴۰ ، ۴۱ ، ۹۱، ۱۰۰ ، ۱۲۵ ، ۱۳۹ ، ۱۵۱ ، ۱۵۳ ، ۱۵۴ ، ۱۵۶ ، ۱۶۰ ، ۱۶۲ ،
یوروپی علوم ، اقوام : ۲۰ ، ۳۰ ، ۱۵۴ ، ۱۵۵ ، ۱۵۸ ، ۱۶۱ -
یمن : ۲۲ -
یوگنڈا : ۱۶۵ -
یوگوسلاویہ : ۱۳۶ -
یونان : ۴۰ -

---:o:---

کتب و رسائل

الف

ارمغان حجاز: ۱۵ (ح)، ۲۵ (ح)، ۳۱ (ح)، ۳۵ (ح)، ۴۴ (ح)، ۵۲ (ح)، ۵۴ (ح)، ۷۲ (ح)، ۱۰۸ (ح)، ۱۲۰ (ح)، ۱۴۵ (ح)، ۱۶۱ (ح)، ۱۶۴ (ح)، ۱۶۵ (ح)، ۱۶۸ (ح)، ۱۷۱ (ح)، ۱۷۷ (ح)، ۱۸۱ (ح)، ۱۸۴ (ح)، ۱۸۶ (ح)، ۲۰۳، ۲۰۴ (ح)، ۲۱۴ (ح) -

اسرار خودی: ۱۲ (ح)، ۶۱ (ح)، ۸۱ (ح)، ۸۴ (ح)، ۲۰۵ (ح) -

اسرار و رموز: ۵۵ (ح)، ۶۲ (ح)، ۱۲۶ (ح)، ۱۲۷ (ح)، ۱۲۸ (ح)، ۱۳۱ (ح)، ۱۳۳ (ح)، ۱۳۴ (ح)، ۱۰۵ (ح)، ۱۳۹ (ح)، ۱۴۰ (ح)، ۱۴۶ (ح)، ۱۵۸ (ح)، ۱۵۹ (ح)، ۱۸۳ (ح)، ۱۸۹ (ح)، ۱۹۱ (ح) -

اقبال ریویو (رسالہ) : ۱۱۲ (ح) -

اقبال کے حضور : ۱۲۹ (ح)، ۱۳۱ (ح)، ۱۵۶ (ح)، ۱۶۲ -

الانسان فی القرآن : ۶۷ (ح)، ۱۱۶ (ح) -

التربیۃ و التعلیم فی الاسلام : ۳۱ (ح)، ۳۴ (ح) -

التعرف : ۲۰۶ (ح)، ۲۰۷ (ح)، ۲۱۰ (ح) -

الفتح الربانی و الفیض الرحمانی : ۱۳ (ح)، ۲۰۵ (ح) -

اسلام ان ماڈرن ہسٹری (Islam in Modern History) : ۱۳۹ (ح)، ۱۵۰ (ح)، ۱۵۷ (ح)، ۱۵۸ (ح) -

اسلام ان دی ورلڈ (Islam in the World) : ۱۳۷ (ح)، ۱۴۲ (ح) -

انجیل : ۱۷۴ -

انڈین فلاسفی (Indian Philosophy) : ۹۹ -

انسائکلوپیڈیا برائٹینیکا (Encyclopaedia Britannica): ۹۹ -

انٹروڈکشن ٹو پیراسائیکالوجی (Introduction to Parapsychology): ۱۱۱ (ح) -

ایجوکیشنل اِشوز ان اے چیجنگ سوسائٹی (Educational Issues in a changing Society): ۳۷ (ح) -

ایقانِ اقبال: ۱، ۲، ۶، ۷ -

ب

بالِ جبریل: ۱۲، ۱۴ (ح، ۱۸ (ح)، ۲۰، ۲۱ (ح)، ۲۳ (ح)، ۲۷ (ح)، ۳۰ (ح)، ۳۶ (ح)، ۴۷ (ح)، ۴۸ (ح)، ۴۹ (ح)، ۵۱ (ح)، ۶۲، ۶۳ (ح)، ۶۴ (ح)، ۶۸ (ح)، ۷۹ (ح)، ۸۰ (ح)، ۸۶ (ح)، ۸۷ (ح)، ۹۱ (ح)، ۹۲ (ح)، ۹۳ (ح)، ۱۱۴ (ح)، ۱۵۹ (ح)، ۱۷۰ ح، ۱۷۴ (ح)، ۱۷۵ (ح)، ۱۸۰ (ح)، ۱۸۲ (ح)، ۱۸۸ (ح)، ۱۸۹ (ح)، ۱۹۱ (ح)، ۱۹۲ (ح)، ۲۰۲ (ح)، ۲۱۴، ۲۱۵ (ح)، ۲۱۶ (ح)، ۲۱۷ (ح)، ۲۱۸ (ح) -

بانگِ درا: ۶۱، ۷۷ (ح)، ۷۸ (ح)، ۷۹ (ح)، ۸۲ (ح)، ۸۵ (ح)، ۹۰ (ح)، ۱۰۱، ۱۰۲ (ح)، ۱۰۳ (ح)، ۱۰۴ (ح)، ۱۰۵ (ح)، ۱۰۶ (ح)، ۱۰۷ (ح)، ۱۲۵ (ح)، ۱۶۰ (ح)، ۲۰۳ (ح) -

بین عالمین (دارالمعارف، مصر): ۵۹ (ح)، ۱۰۰ -

پ

پرسنل ولیوز ان دی ماڈرن ورلڈ (Personal Values in the Modern World): ۲۳ (ح)، ۴۰ (ح) -

پس چہ باید کرد: ۳۹ (ح)، ۴۳ (ح)، ۴۴ (ح)، ۸۰ (ح)، ۹۱ (ح)، ۲۰۴ (ح)، ۲۱۳ (ح) -

پنجاب ایمیننٹ ہندوز (Punjab Eminent Hindus): ۸۰ (ح) -

پیام مشرق: ۳۱ (ح)، ۱۵۱ (ح)، ۱۷۴ (ح) -

ت

تشکیلِ جدید الٰہیات اسلامیہ: ۱۸ (ح)، ۲۹ (ح)، ۴۶ (ح)، ۴۸ (ح)، ۴۹ (ح)، ۵۰ (ح)، ۵۱ (ح)، ۵۵ (ح)، ۵۸ (ح)، ۶۰ (ح)، ۶۱ (ح)،

۶۶ (ح) ، ۷۲ (ح) ، ۸۹ ، ۱۰۸ (ح) ، ۱۰۹ (ح) ، ۱۱۰ (ح) ، ۱۱۳ (ح) ، ۱۱۴ (ح)، ۱۱۷ (ح) ، ۱۱۹ (ح) ، ۱۳۵ (ح) -

تہافۃ الفلاسفہ : ۱۱۸ (ح) -

تہذیب الاخلاق (دار مکتبۃ الحیاۃ بیروت) : ۵۷ (ح) ، ۷۰ (ح) -

تطور الفکر والدین فی مصر القدیمۃ (دارسکرنک القاہرہ) : ۹۷ (ح) -

ج

جاوید نامہ : ۱۲ (ح) ، ۱۸ (ح) ، ۴۰ (ح) ، ۴۳ (ح)، ۶۳ (ح)، ۶۹ (ح)، ۷۲ (ح)، ۱۱۵ (ح)، ۱۳۸ (ح) ، ۱۵۸ (ح) ، ۱۷۳ (ح) ، ۱۸۲ (ح) ، ۱۸۳ (ح)، ۱۹۶ (ح) -

ح

حدیث : ۷ ، ۱۲۶ ، ۱۸۹ ، ۱۹۱، ۱۹۸ ، ۱۹۹ ، ۲۰۱ ، ۲ ۵ ، ۲۰۷ ، ۲۱۳ -

ہسٹری آف ممیفیکیشن اِن ایجپٹ (History of Mumification : in Egypt) ۹۸ -

ہیملٹ (ڈرامہ) : ۱۱۲ -

ہاؤ ڈو یو لیو ون یو ڈائی :(How do you live when die) ۱۰۰ -

ہیومن ڈسٹی نی : Human Destiny ۱۷ (ح) ، ۱۸ -

خ

خلاصہ مثنوی (مولانا روم) : ۲۴ (ح) -

د

دیوان ابو طالب کلیم : ۲۳ (ح) -

ڈ

ڈائیلاگ آف پلاٹو : (Dialogue of Plato) ۱۰۳ (ح) -

ڈویلپمنٹ آف ریلیجین اینڈ تھاٹ اِن اینشنٹ ایجپٹ (D velopment of Religion and Thought in Ancient : Egypt) ۹۷ -

ر

رسالہ قشیریہ (اردو ترجمہ) : ۲۱۱ (ح) ، ۲۱۳ (ح) -

روڈ ٹو مکہ : (Road to Mecca) : ۱۵۲ -

ز

زبورِ عجم : ۲۸ (ح) ، ۳۰ (ح)،
۳۱ (ح) ، ۱۷۵ (ح)، ۲۱۴
(ح)، ۲۱۸ (ح) -

س

سیزر اینڈ کرائسٹ
: (Caesar and Christ)
۴۱ (ح) -

ض

ضربِ کلیم : ۱۲ (ح) ، ۲۰ (ح)،
۲۳ (ح) ، ۲۶ ، ۲۸ (ح) ،
۵۳ (ح) ، ۵۹ (ح)، ۶۴ (ح)،
۶۵ (ح) ، ۶۸ (ح) ، ۸۱ (ح)،
۸۷ (ح) ، ۸۸ (ح) ، ۸۹ (ح)،
۱۱۳ (ح) ، ۱۴۲ (ح) ، ۱۷۷
(ح) ، ۱۸۸ (ح)، ۲۰۲ (ح) ،
۲۰۳ (ح) ، ۲۰۸ (ح) -

ع

علامہ اقبال کی فارسی غزل : ۱ ،
۲ -
عوارف المعارف : ۳۶ (ح) ، ۶۵ ،
۶۶ ، ۲۰۱ (ح) ، ۲۰۶ (ح) ،
۲۱۰ ، ۲۱۱ (ح) ، ۲۱۲ ،
۲۱۷ (ح) -

غ

غنیۃ الطالبین (اردو ترجمہ) :
۲۰۰ (ح) -

ف

فتح الرحمانی : ۱۸۷ -
فوائد الفواد (فارسی) : ۱۰ (ح) ،
۱۵ (ح) -
فیض القدیر : ۱۱ (ح) -
فلاسفی آف ہسٹری
: (Philosophy of History)
۱۶۰ (ح) -

ق

قرآن : ۷ ، ۱۲ ، ۱۳ ، ۱۴ (ح)،
۲۱ ، ۲۲ ، ۲۸ (ح) ، ۲۹ ،
۳۲ (ح) ، ۴۲ ، ۴۶ ، ۴۷
(ح) ، ۴۸ (ح) ، ۴۹ ، ۵۰
(ح)، ۵۳ ، ۵۴ (ح) ، ۵۵ (ح)،
۷۶ ، ۷۷ (ح) ، ۸۰ ، ۸۳
(ح) ، ۸۴ (ح) ، ۸۵ ، ۹۰ ،
۹۷ ، ۱۰۸ (ح) ، ۱۰۹ (ح) ،
۱۱۲ (ح) ، ۱۱۴ (ح) ، ۱۱۵
(ح) ، ۱۱۶ (ح) ، ۱۱۷ (ح) ،
۱۱۹ ، ۱۲۲ ، ۱۲۸ (ح) ،
۱۳۰ ، ۱۳۴ ، ۱۳۶ ، ۱۳۷
(ح) ، ۱۶۳ (ح) ، ۱۶۵ (ح) ،
۱۶۹ (ح) ، ۱۷۰ ، ۱۸۱ ،
۱۸۲ ، ۱۸۳ ، ۱۸۴ (ح) ،
۱۸۵ (ح)، ۱۸۶ ، ۱۹۰ (ح)،
۱۹۱ ، ۱۹۲ ، ۱۹۳ ، ۱۹۴
(ح) ، ۱۹۵ ، ۱۹۶ ، ۱۹۸

(ح) ، ۲۰۴ ، ۲۰۵ ، ۲۰۶
(ح) ، ۲۱۰ (ح) -
قضیة الاوھیة : ۵۹ -

ک

کتاب الروح : ۹۹ -
کشف المحجوب : ۲۰۲ (ح) ، ۲۰۷ (ح) ، ۲۰۹ (ح) -

گ

گلستانِ سعدی : ۱۴۸ -

ل

لندن ٹائمز (رسالہ) : ۱۵۶ -

م

ماللہند : ۱۲۷ -
مائنڈ اینڈ اِٹس پلیس ان نیچر (Mind and its Place in Nature) : ۱۰۰ -
مثنوی ، رازی : ۲۴ -
مصباح الہدایت ، فارسی ترجمہ عوارف المعارف : ۲۱۰ (ح) ، ۲۱۲ (ح) -
مکتوبِ امام ربانی : ۲۰۸ (ح) -
ملفوظاتِ اقبال : ۱۱۵ (ح) -
موت کے بعد : ۱۰۰ -
محمڈن ازم (Mohammadenism) : ۱۴۰ (ح) -
میزانِ اقبال : ۱ ، ۶ -
مین ، سیلف اینڈ سوسائٹی (Man, Self and Society) : ۳۴ (ح) -
مینِنگ آف پاکستان (Meaning of Pakistan) : ۱۳۵ (ح) -
مسلم انسٹی ٹیوشنز (Muslim Institutions) : ۱۳۷ (ح) ، ۱۳۸ (ح) ، ۱۵۳ (ح) -

ن

نفحات الانس : ۸۱ ، ۲۱۶ (ح) -

و

ویدانتا دی (Vedanta, the) : ۹۹ -

ی

یو کین سپیک ود یور ڈیڈ (You can speak with your dead) : ۱۰۰ -

—:o:—

افکار و نظریات

آ

آدم بو : ۱۲۸ ، ۱۳۰ -

آدمی ، آدمیت : ۷ ، ۱۰ ، ۱۱ ، ۱۴ ، ۱۵ ، ۱۶ ، ۱۸ ، ۱۹ ، ۲۰ ، ۲۱ ، ۲۴ ، ۲۵ ، ۲۶ ، ۲۸ ، ۲۹ ، ۳۰ ، ۳۱ ، ۳۲ ، ۳۶ ، ۴۰ ، ۵۷ ، ۵۸ ، ۸۶ ، ۹۰ ، ۹۱ ، ۱۰۷ ، ۱۱۰ ، ۱۲۰ ، ۱۲۱ ، ۱۲۸ ، ۱۲۹ ، ۱۵۱ ، ۱۵۶ ، ۱۵۹ ، ۱۶۷ ، ۱۶۸ ، ۱۷۲ ، ۱۸۰ ، ۱۹۲ ، ۱۹۸ ، ۲۰۰ ، ۲۰۱ ، ۲۱۱ ، ۲۱۲ ، ۲۱۳ ، ۲۱۵ -

آزادی : ۲۶ ، ۴۸ ، ۴۹ ، ۵۸ ، ۶۴ ، ۱۵۵ ، ۱۷۲ ، ۲۰۲ -

آگاہی : ۱۱ ، ۲۶ ، ۲۸ ، ۳۱ ، ۷۰ ، ۸۲ ، ۱۶۸ -

آگہی : ۱۲ -

الف

ابراہیمی[4] نظر : ۷ ، ۷۴ ، ۷۶ ، ۷۷ ، ۷۸ ، ۸۰ ، ۸۴ ، ۸۵ ، ۹۰ ، ۹۲ -

ابلاغ : ۵۷ -

احیاء ملت : ۵ -

اخلاق : ۱۰ ، ۱۱ ، ۱۹ ، ۳۱ ، ۳۲ ، ۳۳ ، ۳۷ ، ۴۰ ، ۴۱ ، ۴۴ ، ۵۶ ، ۱۱۲ ، ۱۳۴ ، ۱۴۳ ، ۱۹۳ ، ۱۹۴ ، ۲۱۵ ، ۲۱۶ -

اسلام : ۶ ، ۲۲ ، ۲۳ ، ۴۶ ، ۵۵ ، ۸۱ ، ۸۵ ، ۹۹ ، ۱۱۵ ، ۱۱۹ ، ۱۲۲ ، ۱۲۵ ، ۱۲۶ ، ۱۲۹ ، ۱۳۱ ، ۱۳۲ ، ۱۳۵ ، ۱۳۶ ، ۱۳۷ ، ۱۳۹ ، ۱۴۰ ، ۱۴۲ ، ۱۴۵ ، ۱۴۶ ، ۱۵۲ ، ۱۵۵ ، ۱۵۶ ، ۱۵۷ ، ۱۵۸ ، ۱۶۵ ، ۲۰۵ ، ۲۰۶ ، ۲۰۷ ، ۲۰۸ ، ۲۱۴ ، ۲۱۵ ، ۲۱۷ ، ۲۱۸ -

افکار ، نظریات : ۱ ، ۲ ، ۵ ، ۶ ، ۷ ، ۸ ، ۲۰ ، ۸۶ ، ۸۷ ، ۸۹ ، ۱۰۲ ، ۱۱۰ ، ۱۲۵ ، ۱۲۶ ، ۱۳۳ ، ۱۳۶ ، ۱۴۰ ، ۱۵۵ ، ۱۵۶ ، ۱۵۹ ، ۱۶۱ ، ۱۷۸ ، ۱۷۹ ، ۲۰۲ ، ۲۰۳ -

آست : ۱۲۲ ، ۱۲۴ ، ۱۲۹ ، ۱۳۲ ، ۱۳۳ ، ۱۳۹ ، ۱۴۵ ، ۱۵۰ ، ۱۵۱ ، ۱۶۳ ، ۱۸۸ ، ۱۹۳ ، ۱۹۵ ، ۲۱۴ ، ۲۱۵ ، ۲۱۶ -

انسانیت : ۱۷ ، ۲۰ ، ۲۳ ، ۴۰ ، ۴۲ ، ۴۳ ، ۴۴ ، ۵۹ ، ۶۶ ، ۸۷ ، ۱۲۹ ، ۱۵۵ ، ۱۸۰ ، ۱۹۳ ، ۱۹۴ ، ۲۰۶ -

اواگون : ۱۱۲ -

ایثار : ۱۹۹ ، ۲۱۰ ، ۲۱۱ ، ۲۱۳ ، ۲۱۸ -

ایقان : ۱ ، ۲ ، ۶ ، ۷ ، ۱۴۶ ، ۱۴۷ ، ۲۰۶ -

ایمان : ۱۶ ، ۲۲ ، ۴۳ ، ۵۸ ، ۵۹ ، ۷۶ ، ۸۰ ، ۸۵ ، ۹۲ ، ۹۵ ، ۱۴۰ ، ۱۴۶ ، ۱۵۶ ، ۱۷۹ ، ۱۸۰ ، ۱۸۱ ، ۱۸۵ ، ۱۸۶ ، ۱۸۸ ، ۱۸۹ ، ۱۹۲ ، ۲۰۵ ، ۲۰۶ ، ۲۱۰ -

ب

بدھ مت : ۹۸ ، ۹۹ -

بصیرت : ۱۸ ، ۱۷۴ ، ۱۷۵ ، ۲۱۵ -

بقا : ۱۰۶ ، ۱۱۱ ، ۱۱۳ ، ۱۱۷ -

پ

پیش لفظ : ۱ ، ۵ -

ت

تخلیق : ۴۸ ، ۴۹ ، ۵۸ ، ۵۹ ، ۹۰ ، ۱۸۲ ، ۲۰۴ -

تصور : ۷ ، ۴۶ ، ۴۹ ، ۵۰ ، ۹۶ ، ۹۷ ، ۹۸ ، ۹۹ ، ۱۱۱ ، ۱۱۲ ، ۱۲۲ ، ۱۲۶ ، ۱۳۵ ، ۱۴۳ ، ۱۴۵ ، ۱۵۸ ، ۱۵۹ ، ۱۶۰ ، ۱۶۲ ، ۱۶۴ -

تصوف (صوفیہ ، اولیاء فقراء ، درویش) : ۷ ، ۱۰ ، ۳۲ ، ۳۳ ، ۳۴ ، ۹۹ ، ۱۴۸ ، ۱۹۳ ، ۱۹۹ ، ۲۰۱ ، ۲۰۲ ، ۲۰۴ ، ۲۰۷ ، ۲۰۸ ، ۲۱۲ ، ۲۱۶ ، ۲۱۷ ، ۲۱۸ -

تعلیم ، تربیت : ۷ ، ۱۰ ، ۱۴ ، ۱۷ ، ۱۸ ، ۲۵ ، ۳۰ ، ۳۱ ، ۳۲ ، ۳۳ ، ۳۶ ، ۳۸ ، ۳۹ ، ۵۰ ، ۵۳ ، ۵۸ -

تقدیر : ۷ ، ۴۶ ، ۴۸ ، ۵۲ ، ۵۳ ، ۵۵ ، ۵۹ ، ۶۱ ، ۶۳ ، ۶۴ ، ۶۷ ، ۶۸ ، ۶۹ ، ۷۰ ، ۷۱ ، ۷۲ ، ۷۸ ، ۷۹ ، ۱۷۱ ، ۲۰۳ -

تناسخ : ۹۹ -

توحید : ۴۳ ، ۴۴ ، ۵۳ ، ۶۰ ، ۸۱ ، ۱۴۰ ، ۱۴۲ -

ث

ثقافت اسلامی : ۵۳ -

ج

جبلّت : ١٥ ، ٢٥ ، ٢٨ ، ٥٦ ،
٦٥ ، ٦٦ ، ٦٨ ، ٨٧ ، ٩٦ ،
٢٠٤ -

ح

حیات ، حیات بعد الموت : ٧ ،
٩٥ ، ٩٦ ، ٩٧ ، ٩٨ ، ٩٩ ،
١٠٠ ، ١٠٢ ، ١٠٣ ، ١٠٤ ،
١٠٧ ، ١٠٨ ، ١٠٩ ، ١١٠ ،
١١٢ ، ١١٣ ، ١١٥ ، ١١٦ ،
١١٧ ، ١١٨ ، ١١٩ ، ١٢٠ ،
١٥٢ ، ١٦٣ ، ١٦٧ ، ١٨١ -

خ

خطبہ حجۃ الوداع : ١٣٦ -
خودی : ٦ ، ١٢ ، ٤٦ ، ٥٢ ،
٥٨ ، ٦٠ ، ٦٢ ، ١٠٧ ،
١٠٨ ، ١٠٩ ، ١١٠ ، ١١٢ ،
١١٣ ، ١١٤ ، ١١٥ ، ١١٧ ،
١١٩ ، ١٦٨ ، ١٧٧ ، ٢٠٢ -
خیر و شر : ١٣ ، ٢٨ ، ٤١ ،
٤٢ ، ٥٦ ، ٥٧ ، ٥٨ ، ٦٠ ،
١٣٦ ، ١٧٣ -

د

دل ، قلب : ٩ ، ١٣ ، ١٤ ،
١٥ ، ١٦ ، ١٨ ، ٢١ ، ٢٢ ،
٢٣ ، ٢٦ ، ٢٨ ، ٢٩ ، ٣٠ ،
٣١ ، ١٦٨ ، ١٧٠ ، ١٧٢ ،
١٧٩ ، ١٨٠ ، ١٨٤ ، ١٨٨ ،
١٩١ ، ١٩٢ ، ٢٠٠ ، ٢١٣ ،
٢١٥ ، ٢١٧ ، ٢١٨ -
دھرتی پوجا : ١٢٦ ، ١٢٧ ،
١٢٩ ، ١٤١ ، ١٥٧ -

ذ

ذات : ١٨ ، ٢٥ ، ٣٠ ، ٣١ ،
٤١ ، ٤٨ ، ٤٩ ، ٥١ ، ٦١ ،
١٠٨ ، ١٠٩ ، ١١٢ -

ر

روح : ١٤ ، ١٥ ، ١٦ ، ١٨ ،
١٩ ، ٢١ ، ٢٦ ، ٢٩ ، ٣٠ ،
٣٦ ، ٥٦ ، ٨٦ ، ٩٠ ، ٩٨ ،
١٠٠ ، ١٠١ ، ١٠٢ ، ١٠٣ ،
١٠٤ ، ١١٠ ، ١٨ ، ١٢٦ ،
١٣٢ ، ١٦٨ ، ١٦٩ ، ١٧٠ ،
١٧٦ ، ١٧٩ ، ١٨٠ ، ٢٠٠ -
ریاست ، علیحدہ : ١٦٣ -

ز

زندگی : ١٧ ، ٢٥ ، ٢٦ ، ٣٥ ،
٥٦ ، ٩٦ ، ٩٧ ، ١٠١ ، ١٠٤ ،
١٠٥ ، ١٠٧ ، ١٠٩ ، ١١٥ ،
١١٩ ، ١٣٩ ، ١٦٧ ، ١٧٢ ،
١٧٥ ، ١٧٦ ، ١٧٨ ، ١٨٠ ،
١٨١ -

س

ساق : ١٨ ، ١٨٨ ، ١٨٩ ، ١٩٥ ،
٢١٧ -

سائنس : ۱۹ ، ۹۰ ، ۱۰۰ -
سوسائٹی ، معاشرہ : ۳۴ ، ۳۹ ، ۴۲ ، ۴۴ ، ۶۱ ، ۱۳۷ ، ۱۷۲ ، ۱۷۳ ، ۱۷۴ ، ۱۷۶ ، ۱۷۹ ، ۱۸۰ ، ۱۹۲ ، ۱۹۳ ، ۲۱۶ -

ش

شخصیت : ۱۶ ، ۲۲ ، ۲۴ ، ۳۶ ، ۸۷ ، ۹۲ ، ۱۷۳ ، ۱۷۹ -
شریعت : ۲۰۸ ، ۲۱۶ -

ض

ضمیر : ۲۶ ، ۳۹ ، ۴۸ -

ع

عرضداشت : ۱ -
عشق : ۸۲ ، ۸۳ ، ۸۴ ، ۱۰۱ ، ۱۷۰ ، ۱۷۹ ، ۱۸۰ ، ۱۸۸ ، ۱۸۹ ، ۱۹۰ ، ۱۹۲ ، ۱۹۵ ، ۲۰۳ ، ۲۱۱ -
عقیدہ : ۲۳ ، ۵۲ ، ۱۲۰ ، ۱۳۸ ، ۱۴۰ ، ۱۴۱ -
علم : ۸ ، ۱۰ ، ۱۱ ، ۱۲ ، ۱۳ ، ۱۴ ، ۱۶ ، ۱۷ ، ۱۸ ، ۱۹ ، ۲۰ ، ۲۱ ، ۲۲ ، ۲۳ ، ۲۸ ، ۲۹ ، ۳۰ ، ۳۱ ، ۳۲ ، ۳۳ ، ۳۴ ، ۳۵ ، ۴۲ ، ۴۳ ، ۴۴ ، ۵۳ ، ۶۶ ، ۷۰ ، ۸۱ ، ۸۷ ، ۸۸ ، ۹۰ ، ۱۴۷ ، ۱۷۳ ، ۱۷۴ ، ۱۷۷ ، ۱۷۹ ، ۲۰۵ ، ۲۰۶ ، ۲۰۷ ، ۲۱۵ -
عمل : ۱۱ ، ۱۷ ، ۲۱ ، ۲۷ ، ۴۱ ، ۴۲ ، ۵۰ ، ۵۱ ، ۵۲ ، ۵۵ ، ۵۶ ، ۵۷ ، ۵۸ ، ۷۶ ، ۸۰ ، ۹۲ ، ۹۸ ، ۹۹ ، ۱۴۰ ، ۱۸۱ ، ۱۸۷ ، ۱۹۲ ۲۰۶ ، ۲۰۷ ، ۲۱۵ ، ۲۱۷ -

ف

فقر ، فقیر : ۷ ، ۲۳ ، ۱۹۷ ، ۱۹۸ ، ۲۰۰ ، ۲۰۱ ، ۲ ۲ ، ۲۰۳ ، ۲۰۴ ، ۲۰۸ ، ۲۰۹ ، ۲۱۱ ، ۲۱۲ ، ۲۱۳ ، ۲۱۴ ، ۲۱۵ ، ۲۱۶ ، ۲۱۷ ، ۲۱۸ -
فقہ اسلامی : ۱۳۱ ، ۱۴۰ -
فکر : ۷ ، ۸ ، ۲۵ ، ۴۱ ، ۴۸ ، ۸۹ ، ۱۷۴ ، ۱۹۹ ، ۲۰۰ ، ۲۱۵ ، ۲۱۷ -
فلسفہ : ۷ ، ۲۳ ، ۴۱ ، ۹۰ ، ۱۰۷ ، ۱۰۹ ، ۱۱۹ ، ۱۴۸ -
فنا ، بقا : ۹۶ ، ۱۰۱ ، ۱۰۴ ، ۱۰۶ ، ۱۱۰ ، ۱۱۱ ، ۱۱۳ ، ۱۱۷ -

ق

قوم، قومیت: ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۱۲۲، ۱۲۳ ، ۱۲۴ ، ۱۲۵ ، ۱۲۶ ، ۱۲۷ ، ۱۲۸ ، ۱۳۲ ، ۱۳۳ ، ۱۳۵ ، ۱۴۱ ، ۱۵۰ ، ۱۵۲ ، ۱۵۳ ، ۱۵۵ ، ۱۵۶ ، ۱۵۹ ، ۱۶۰ ، ۱۶۱ ، ۱۶۲ ، ۱۶۳ ،

۱۷۰ ، ۱۷۱ ، ۱۷۴ ، ۱۷۷ ، ۱۷۸ ، ۱۹۲ ، ۱۹۴ ، ۱۹۵ ، ۲۰۳ ، ۲۰۵ -

ک

کانگریس (انڈین نیشنل) : ۱۶۰ ، ۱۶۱ -

کردار : ۱۶ ، ۱۹ ، ۲۲ ، ۲۴ ، ۳۱ ، ۳۲ ، ۳۸ ، ۹۲ ، ۱۹۲ ، ۲۱۵ ، ۲۱۶ -

کفر ، کافر : ۱۶ ، ۳۱ ، ۱۶۳ ، ۱۸۹ ، ۱۹۸ ، ۱۹۹ ، ۲۰۴ -

کمیونزم (اشتراکیت) : ۵۸ ، ۱۱۲ ، ۱۳۶ ، ۱۵۵ ، ۱۵۶ -

ل

لبرلزم : ۱۵۷ -

م

مادیت : ۲۰ ، ۸۶ ، ۹۱ -

محبّت : ۱۸۲ ، ۱۸۸ ، ۱۸۹ ، ۱۹۰ ، ۱۹۱ ، ۲۰۰ -

مرگِ مجازی : ۷ ، ۱۶۷ ، ۱۶۹ ، ۱۷۱ -

مسلمان ، مومن : ۶ ، ۱۱۳ ، ۱۱۵ ، ۱۲۰ ، ۱۲۴ ، ۱۲۵ ، ۱۲۶ ، ۱۲۷ ، ۱۲۸ ، ۱۳۰ ، ۱۳۴ ، ۱۳۵ ، ۱۳۶ ، ۱۳۷ ، ۱۳۸ ، ۱۴۰ ، ۱۴۴ ، ۱۴۵ ، ۱۴۶ ، ۱۴۷ ، ۱۴۸ ، ۱۶۱

۱۶۳ ، ۱۷۱ ، ۱۸۱ ، ۱۸۲ ، ۱۸۳ ، ۱۸۴ ، ۱۸۵ ، ۱۸۶ ، ۱۸۹ - ۱۹۰ - ۱۹۳ - ۱۹۵ - ۲۰۲ - ۲۰۹ - ۲۱۷ -

مسیحیت : ۱۶ - ۶۶ - ۱۳۰ - ۱۳۵ - ۱۳۶ - ۱۴۳ - ۱۵۴ - ۱۵۷ -

مثلاً : ۵۲ - ۲۱۶ - ۲۱۷ -

ملّت : ۷ - ۵۲ - ۵۳ - ۵۴ - ۱۲۲ - ۱۲۴ - ۱۲۵ - ۱۲۶ - ۱۳۲ - ۱۳۳ - ۱۳۴ - ۱۳۵ - ۱۳۸ - ۱۳۹ - ۱۴۲ - ۱۴۵ - ۱۴۸ - ۱۶۲ - ۱۶۴ - ۱۷۱ - ۱۸۲ - ۱۸۸ - ۱۹۲ - ۲۰۳ -

موت ، مردہ : ۲۸ - ۹۴ - ۹۵ - ۹۶ - ۹۷ - ۹۸ - ۱۰۲ - ۱۰۵ - ۱۰۶ - ۱۰۷ - ۱۰۸ - ۱۰۹ - ۱۱۱ - ۱۱۲ - ۱۱۳ - ۱۱۴ - ۱۱۵ - ۱۱۶ - ۱۱۷ - ۱۳۰ - ۱۶۷ - ۱۶۹ - ۱۷۰ - ۱۷۲ - ۱۷۵ - ۱۷۶ - ۱۷۷ - ۱۸۰ - ۱۸۱ - ۱۸۶ - ۱۸۷ - ۱۸۹ - ۱۹۴ -

موضوعات (ایقان اقبال) : ۷ - ۸ -

ن

نروان : ۱۱۲ -

نسل : ۱۱۴ - ۱۲۵ - ۱۲۹ - ۱۳۰ - ۱۳۱ - ۱۳۲ - ۱۴۰ - ۱۴۴ - ۱۵۶ - ۱۶۰ - ۱۹۲ - ۱۹۳ -

نفسِ امّارہ : ۶۷ -

نیشنلزم : ۱۵۵ - ۱۵۷ -

ہ

ہجرت : ۱۲۶ - ۱۲۷ - ۱۳۱ -
۱۳۲ - ۱۶۳ -

ہندو : ۹۸ - ۹۹ - ۱۲۷ - ۱۲۸ -
۱۳۰ - ۱۳۵ - ۱۶۰ ، ۶۱۱ -

و

وطن ، وطنیت : ۱۲۳ - ۱۲۴ -
۱۲۵ - ۱۲۶ - ۱۲۷ - ۱۲۸ -
۱۲۹ - ۱۳۱ - ۱۳۳ - ۱۳۷ -
۱۴۱ - ۱۴۷ - ۱۴۹ - ۱۵۵ -
۱۵۹ - ۱۶۰ - ۱۶۲ - ۱۹۳ -

ی

یقین : ۲۱ - ۲۳ - ۲۵ - ۷۵ -
۸۵ - ۸۷ - ۹۵ - ۹۷ - ۱۰۳ -
۱۸۰ - ۱۸۱ - ۲۰۵ - ۲۰۶ -
۲۱۴ -

یہود : ۱۲۴ - ۱۲۸ - ۱۳۰ -
۱۵۷ - ۱۶۲ -

یوم اقبال : ۶ -

--:o:--